نو ترمیم

نظمِ آزاد

جو حسن و عشق کی قید سے آزاد ہے

مع ازدیاد جدید غزلیات و قصائد

از

شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم
سابق پروفیسر عربی گورنمنٹ کالج لاہور

حسب فرمائش خلیفہ سیّد محمد سالم مینجر آزاد بک ڈپو لاہور

سنہ ۱۹۱۰ء

نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپی

قیمت فی جلد ۸ ؍

زبانِ فارسی کی ایک مکمل تاریخ موسومہ

سخندانِ فارس

از شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد مرحوم۔

مصنف نے پندرہ برس کی محنت میں اسے تیار کیا ہے۔ نہایت قابلِ قدر اور دلچسپ کتاب ہے۔ مختلف زبانوں کے مقابلہ سے قوموں کے باہمی رشتوں کے مٹے ہوئے سراغ دکھائے ہیں۔ ژند۔ پہلوی۔ دری۔ سنسکرت کے الفاظ کا مقابلہ کرکے تاریخی نتائج نکالے ہیں۔ ایران کے رسم و رواج قدیمہ کا مقابلہ ہندوستان کے ساتھ کیا ہے اور اپنی سیاحتِ ایران کے دلچسپ حالات موقع موقع پر درج کئے ہیں۔ مشہور مصنفین کے کلام نظم و نثر کے مابہ الامتیاز دکھلائے ہیں۔ حصۂ اول جو مطبع رفاہ عام سے مختصر رسالہ کی صورت میں شائع ہوا تھا اصل کتاب کی ابتدائی تمہید تھی۔ اب مکمل کتاب چھپی ہے۔ زبان فارسی کی ایسی تاریخ اب تک ہندوستان میں نہیں لکھی گئی۔ اعلےٰ درجہ کے ڈمائی کاغذ پر۔ نہایت خوشخط۔ تقطیع ۲۰×۲۶ حجم ۴۲۲ صفحہ۔

قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ (عہ/)

صرف آزاد بک ڈپو۔ اکبری منڈی۔ لاہور سے مل سکتی ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہید (طبعِ ثانی)

اس مجموعہ کا پہلا اڈیشن میں نے ۱۸۹۹ء میں شائع کیا تھا۔ وہ ختم ہو گیا اور افسوس ہے کہ والد مرحوم بھی ۲۲ جنوری سنہ ۱۹۱۰ء مطابق ۹ محرم الحرام سنہ ۱۳۲۸ھ کو اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔ میرا ارادہ تھا کہ جس قدر ان کا کلام مجھے مسودوں کے بستوں میں سے ہاتھ آئے اس کے ساتھ شامل کر دوں لیکن اس وقت ان کے انتقال کی وجہ سے اہل طلب کو ان کے کلام کا اشتیاق زیادہ ہے۔ اور تمام مسودوں کا تلاش کرنا بھی آسان کام نہیں ہے۔ اس لئے جس قدر کلام مجھے مل سکا اس میں شامل کرتا ہوں۔ جو اَور ہاتھ آئیگا آیندہ تیسرے اڈیشن میں شائع کرونگا ؞

خاکسار
بندہ محمد ابراھیم
منصف امرتسر

مورخہ ۱۲ فروری
سنہ ۱۹۱۰ء

تمہید (طبعِ اوّل)

عرصہ دراز سے والد ماجد کے احباب متقاضی تھے کہ اُن کی نظموں کو جمع کر کے شائع کر دیا جائے۔ میں نے بھی مناسب سمجھا۔ پھٹے پُرانے پرزے چھوٹی چھوٹی نظمیں جو کہیں کہیں طبع ہو چکی تھیں۔ اور بعض تھیں کہ لوگوں کی نظر سے بھی نہیں گزری تھیں۔ ممکن تھا کہ ضائع ہو جائیں۔ اس لئے جمع کر کے ایک پمفلٹ کے طور پر چھپوا دی ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ اس قسم کی بہت سی نظمیں مجھے ہاتھ نہ آئیں معلوم نہیں حالت پریشانی میں کہاں ضائع ہو گئیں ؛

شعر و شاعری کا شوق انہیں ابتدائے عمر سے تھا۔ جیسا کہ دیوان ذوق کے ابتدائی صفحوں میں اُنھوں نے خود تحریر فرمایا ہے۔ اور طالب علمی کے زمانہ سے استاد ذوق علیہ الرحمۃ کی حضوری میں رہتے تھے۔ خود بھی کہتے تھے۔ استاد مرحوم کی وفات کے بعد خود کہنے کی زیادہ ضرورتیں لاحق ہوئیں۔ اور اپنا کلام مشاعروں میں پڑھنے لگے۔ لیکن اُس وقت صرف غزل۔ رباعی۔ قصیدہ وغیرہ تک شوق محدود رہا۔ افسوس ہے کہ اُس وقت کا کلام جس قدر تھا ۱۸۵۷ء کے طوفان میں تباہ ہو گیا۔ اور اس کا کوئی نمونہ اس وقت میرے پاس نہیں جو اس مجموعہ میں شامل کروں۔ البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد جب جگراؤں پہنچے۔ اور پھر سرکار جیند میں ملازم ہوئے۔ تو اُنھوں نے سلام۔ مرثیہ۔ قصاید اور غزلیں لکھیں۔ ان میں سے بعض مجھے ہاتھ آگئیں۔ لیکن اس مجموعہ میں صرف ایک قصیدہ درج کیا گیا ہے (دیکھو صفحہ ۱۱) مرثیہ وغیرہ چھوڑ دئے ہیں۔ اس کے بعد روزی کی فکر نے عرصہ دراز تک فرصت نہ دی کہ شاعری کی طرف توجہ کرتے۔ تھوڑے دنوں کے بعد جب

دفتر ڈائرکٹری میں تصنیفات کے کام سے تعلّق ہوگیا۔ اس وقت پھر خیال اس طرف متوجہ ہوا۔ کیونکہ کرنیل ہالرائیڈ صاحب بہادر اعلےٰ درجہ کے مُبصّر۔ نکتہ سنج اور زباندانی کے شوقین تھے۔ ان کی طبیعت کو نیچر نے خاص ملکہ اس کام کا دیا تھا۔ دُنیا کا عام قاعدہ ہے کہ جس کام کا شوق حکّام کو ہوجاتا ہے۔ اسی طرف ماتحت بھی متوجہ ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ صاحب موصوف کی ہدایتوں کے بموجب اُنھوں نے اس نئے ڈھنگ کی نظم لکھنے کی بُنیاد ڈالی۔ جوکہ اب خاص و عام لکھنے لگے ہیں اور گھر گھر میں ذوق و شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے نظم اور اُسی کے مُتعلّق ایک مضمون اُنھوں نے مئی ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب کے جلسہ میں پڑھا۔ جو اس مجموعہ کے صفحہ ۱۲ سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت پُرانے خیالات کے لوگوں نے اس کی بڑی مخالفت کی۔ اور ہندوستان کے مختلف اخبارات میں خوب گالیاں دیں۔ مگر قدرتی موج کو کسی طرح روک نہ سکے کہ چشمہ بہ نکلا تھا۔ البتّہ اتنا اثر اس مخالفت کا ہوا کہ مشاعرہ ایک سال سے زیادہ نہ رہ سکا۔ اس کی بُنیاد ایسے مبارک وقت میں پڑی تھی۔ کہ اب ہر شہر و دیار میں اسی قسم کی نظمیں تصنیف ہوتی ہیں۔ اور لوگ اُن کو قومی نظمیں کہتے ہیں *

مشاعرہ مذکورۂ بالا کے بند ہونے کے بعد وہ کبھی کبھی انگریزی نظموں کے انداز پر نظم لکھتے رہے۔ یہ بالکل انگریزی نظم کا ترجمہ نہیں ہیں۔ چنانچہ ناظرین مقابلہ کرکے دیکھینگے کہ انگریزی نظم (ایکسلشیر) کے انداز پر جو نظم ہے (دیکھو صفحہ ۹۷ اُلوالعزمی کے لئے کوئی سدِّ راہ نہیں)۔ وہ ترجمہ نہیں ہے۔ البتّہ انگریزی مطالب کو ہمارے انداز میں اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اسی طرح تمام نظمیں صفحہ ۹۳ ۱۱۱ تک انگریزی مطالب ہیں۔ مگر اُن کو نہیں کہہ سکتے۔ کہ یہ انگریزی کا ترجمہ ہے۔ والد ماجد کے مختلف احباب سے التماس ہے کہ اگر کوئی نظم اُن کے پاس ایسی موجود ہو جو اس مجموعہ میں شامل نہ ہو۔ تو وہ براہ عنایت میرے پاس ارسال کریں تاکہ طبع ثانی میں شامل کردی جائے *

اِس موقع پر میں نے چاہا تھا کہ والد ماجد اِن مسوّدوں پر نظر ثانی کر دیں۔ مگر وہ چند سال سے فلسفۂ الٰہیہ اور اُس کی کتابوں کے مُطالعہ کو سب سے مقدّم سمجھتے ہیں۔ طبیعت اِدھر نہ آئی۔ فرمایا۔ "جو ہو گیا۔ سو ہو گیا۔ اب نہیں ہو سکتا۔ وہ عالَم اَور تھا۔ یہ عالَم اَور ہے۔ تُمہیں شہرت کا شوق ہے چھپوا دو"۔ مجھ سے یہی ہو سکا۔ کہ جس طرح اصل مسوّدوں میں تھا چھپوا دیا۔ پروردگار حُسنِ قبول روزی کرے +

خاکسار

محمّد ابراھیم
مترجم چیف کورٹ پنجاب
لاہور

مورخہ ۲۴ جولائی سنہ ۱۸۹۹ء

تقریر جلسۂ منعقدۂ ۱۵ راگست ۱۸۶۷ء

نظم اور کلامِ موزوں کے باب میں خیالات

فلاسفۂ یونان کا قول ہے۔ کہ دُنیا میں دو چیزیں نہایت عجیب و حیرت انگیز ہیں۔ اوّل نبضِ انسانی کہ بے گویائی حالِ باطن بیان کرتی ہے۔ دوم شعر کہ انہیں الفاظ کے پس و پیش سے کلام میں موزونیت اور اُس سے ایک تاثیر عجیب دل پر پیدا ہوتی ہے۔ کتابوں میں اکثر شعر کے معنی کلامِ موزون و مقفّٰی لکھے ہیں۔ لیکن درحقیقت چاہیئے۔ کہ وہ کلام مؤثّر بھی ہو۔ ایسا کہ مضمون اُس کا سُننے والے کے دل پر اثر کرے۔ اگر کوئی کلام منظوم تو ہو۔ لیکن اثر سے خالی ہو۔ تو وہ ایک ایسا کھانا ہے۔ کہ جس میں کوئی مزا نہیں۔ نہ کھٹّا نہ میٹھا۔ جیسا کہ شعر کسی استاد کا ہے

دندان تو جملہ در دہانند		چشمانِ تو زیر ابروانند	

جب اِنسان کے دل میں قوتِ گویائی اور جوششِ مضمون مجتمع ہوتے ہیں تو طبیعت سے خود بخود کلام موزوں پیدا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس قدر ایسی قوت اور اُس قوت کا جوش و خروش زیادہ ہوگا۔ اُسی قدر کلام پُر تاثیر ہوگا۔ روے زمین پر پہلا غم ہابیل کا تھا۔ کہ قابیل کے سبب سے حضرت آدمؑ کے دل پر طاری ہوا اُسے نتیجہ جوشِ غم کا سمجھنا چاہیئے۔ کہ باوجودیکہ اُس وقت تک شعر و شاعری کا نام نہ تھا۔ مگر جوشِ طبیعت سے جو کچھ کلام اُس وقت اُن کی زبان سے نکلا موزوں تھا چنانچہ وہ سُریانی میں اب تک موجود ہے۔ جبکہ اصل کلام موزوں کی حضرت آدمؑ سے ہوئی۔ تو فرزند رشید وہی موزوں طبع ہے۔ کہ جو باپ کی میراث سے بہرہ ور ہو۔ اس میں شک نہیں کہ آدمی اور حیوان میں فرق گویائی کا ہے۔ پس

قوت انسانی بھی اُسی میں کامل سمجھنی چاہئے جس میں قوت گویائی کامل ہو۔ چونکہ نظم بہ نسبت نثر کے زیادہ تر زورِ طبیعت سے نکلتی ہے یہی سبب ہے کہ بہ نسبت نثر کے مؤثر بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کوئی مضمون کوئی مطلب کوئی خیال جو انسان کے دل میں آئے یا مخاطب کو سمجھانا چاہے۔ تو تکلم سے نقش مدّعا کو رنگ تقریر میں لاتا ہے۔ تاکہ ظاہر ہو۔ پس شاعر گویا ایک مصوّر ہے۔ لیکن نہ وہ مصوّر کہ خر و اشتر۔ درخت و پتھر کی تصویر کاغذ پر کھینچے۔ بلکہ وہ ایسا مصوّر ہے کہ معنی کی تصویر صفحہ دل پر کھینچتا ہے اور بسا اوقات اپنی رنگینیٔ فصاحت سے عکس نقش کو اصل سے بھی زیادہ زیبائش دیتا ہے۔ وہ اشیاء جن کی تصویر قلمِ مصوّر سے نہ کھنچے یہ زبان سے کھینچ دیتا ہے۔ چنانچہ ہزاروں صفحہ کاغذ بھیگ کر فنا ہو گئے۔ مگر صدہا سال سے آج تک اُن کی تصویریں ویسی کی ویسی ہی ہیں۔ کبھی تصویر غم صفحۂ دل پر کھینچتا ہے۔ کبھی مضامین فرحت وعیش سے طبیعت کو گلزار کرتا ہے۔ انتہائے مرتبہ ہے کہ جب چاہتا ہے ہنسا دیتا ہے جب چاہتا ہے رُلا دیتا ہے۔ اہل عرب معرکہ ہائے قتل میں رجز خوانی کرتے تھے۔ سلاطین ہند کے ہاں صفِ جنگ میں سُور۔ وِیر۔ راوت۔ بھاٹ وہ وہ کڑکے کوت کہتے تھے کہ لوگ اپنی جانیں موت کے مُنہ میں جھونک دیتے تھے۔ اور اب تک یہ عالم ہے۔ کہ جب سُنے جاتے ہیں بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سکندر اعظم کتاب ہومر کو دیکھتا تھا اور سوتے میں بھی جُدا نہ کرتا تھا۔ شاعر اگر چاہے۔ تو امورات عادیہ کو بھی بالکل نیا کر دکھائے۔ پتھر کو گویا کر دے۔ درختانِ پا در گِل کو رواں کر دے۔ ماضی کو حال۔ حال کو استقبال کر دے۔ دُور کو نزدیک کر دے۔ زمین کو آسمان۔ خاک کو طلا۔ اندھیرے کو اُجالا کر دے۔ اگر غور کر کے دیکھو۔ تو اکسیر اور پارس اسی کو کہنا چاہئے۔ کہ جسے چھو جائے سونا ہو جائے۔ زمین اور آسمان اور دونوں جہان شعر کے دو مصرعوں میں ہے۔ ترازو اُس کی شاعر کے ہاتھ میں ہے جدھر چاہے جھکا دے ؛

نظم درحقیقت ایک شاخ گلریز فصاحت کی ہے جس طرح پھولوں کے رنگ و بو

سے دماغ جسمانی تر و تازہ ہوتا ہے۔ شعر سے روح تر و تازہ ہوتی ہے۔ پھولوں کی بُو سے مختلف خوشبوئیاں محسوس دماغ ہوتی ہیں۔ کسی کی بو تیز ہے۔ کسی کی بُو مست ہے۔ کسی بو میں نفاست و لطافت ہے۔ کسی میں سُہانا پن۔ اسی طرح مضامین اشعار کا بھی حال ہے جس طرح پھُول کہ کبھی چمن میں۔ کبھی ہار میں۔ کبھی عطر کھیچ کر۔ کبھی عرق میں جاکر۔ کبھی دُور سے کبھی پاس سے مختلف کیفیتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح مضامین شعری مختلف حالتوں اور مختلف عبارتوں میں رنگارنگ کی کیفیتیں عیاں کرتے ہیں ؂

عالمِ جسمانی میں اِنسان کے لئے غذا مادۂ حیات ہے۔ اسی طرح عالم معنی میں روح کے لئے غذا درکار ہے۔ چونکہ اشعار و مضامینِ لطیف سے روح قوّت کمال اور طاقت بلند پروازی پاتی ہے۔ یہی اُس کی غذا ہے۔ روح کی لطافت و نفاست تو خود ظاہر ہے۔ کہ وہ خاص روح القدس کے آفتاب قدرت کا پرتوہ ہے اسی سے شعر کے جوہر لطافت کو خیال کرنا چاہیئے۔ کہ نفاست میں کس مرتبۂ عالی پر ہوگا۔ شاعر کو ایک نسبت خاص عالم بالا سے ہے۔ کہ بے وساطت اور بے اسباب ظاہری کے اُدھر سے اپنا سلسلہ جاری کرتا ہے۔ فی الحقیقت شعر ایک پرتوہ روح القدس کا اور فیضان رحمت اِلٰہی کا ہے۔ کہ اہل دل کی طبیعت پر نزول کرتا ہے۔ یہی سبب ہے۔ کہ ظاہرا اپنے کلبۂ احزاں میں پڑا رہتا ہے۔ مگر تمام عالم میں اس طرح پر حکومت کرتا ہے۔ جیسے کوئی صاحب خانہ اپنے گھر میں پھرتا ہے۔ پانی میں مچھلی اور آگ میں سمندر ہو جاتا ہے۔ ہوا میں طائر بلکہ آسمان پر فرشتہ کی طرح نکل جاتا ہے۔ جہاں کے مضامین چاہتا ہے بے تکلف لیتا ہے۔ اور بہ تصرّف مالکانہ اپنے کام میں لاتا ہے۔ زہے سعادت اُس کی جسے ایسے ملک معنی کی سلطنت نصیب ہو۔ شعر گلزارِ فصاحت کا پھُول ہے۔ گلہائے الفاظ کی خوشبو ہے۔ روشنی عبارت کا پرتوہ ہے۔ علم کا عطر ہے۔ قوائے روحانی کا جوہر۔ تاثیر معنوی کا ست ہے۔ روح کے لئے آب حیات ہے۔ گرد غم کو دل سے دھوتا ہے

طبیعت کو پھیلاتا ہے۔ خیال کو عروج دیتا ہے۔ دل کو استغنا اور بے نیازی۔ ذہن کو قوّتِ پرواز دیتا ہے۔ گرد افکار سے دامنِ دل کو بلند رکھتا ہے۔ تنہائی میں دل لگی پیدا کرتا ہے۔ وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت سفر در وطن اور سیر در چمن کے یہی معنی ہیں۔ اگرچہ شاعر ہمیشہ فکر و تردّد میں غرق رہتا ہے۔ لیکن ایک شعر کہہ کر جیسی اُس کے دل کو فرحت حاصل ہوتی ہے۔ بادشاہ کو تسخیر ہفت کشور سے نہیں ہوتی۔ دل میں سوز و گداز اور طبیعت میں ایسی قبولیت اثر کی پیدا کرتا ہے۔ کہ بات بات میں ایک لطف اور کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ لطف طاقتِ تحریر و تقریر دونوں سے باہر ہے۔ اس کے اثر سے جو رنج دل پر طاری ہوتا ہے۔ صاحبِ درد ہی اُسے خوب جانتا ہے۔ کہ ہزار خوشیوں سے زیادہ لطف حاصل ہوتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ یہ فضیلت اختیاری نہیں۔ یعنی موزونیِ طبع جوہر خداداد ہے اور اس نعمت کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

رباعی

سرِ غمِ عشق بوالہوس را ندہند	سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند
عمرے باید کہ یار آید بکنار	ایں دولتِ سرمد ہمہ کس را ندہند

جنون بھی ایک طرح سے لازمۂ شاعری ہے۔ بعضے محققوں کا قول ہے کہ دیوانہ اور عاشق اور شاعر کے خیالات بعض بعض مقامات پر متحد ہو جاتے ہیں۔ شاعر کو لازم ہے کہ سب طرف سے مطمئن اور سب خیالات سے منقطع ہو کر اسی کام میں متوجہ اور غرق ہو جائے اور یہ بات سوائے مجنون کے یا عاشق کے۔ کہ وہ برادر مجازی اُس کا ہے۔ ہر ایک شخص سے نہیں ہو سکتی۔ مجنون کو اپنے جنون اور عاشق کو معشوق کے سوا دوسرے سے کچھ غرض نہیں۔ خدا یہ نعمت سب کو نصیب کرے۔

اکثر لوگ ایسے ہیں۔ کہ جسمانی محنت سے مر کھپ کر اُنھوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ مگر لطف شعر سے بہرہ نہیں۔ اگر تمام عمر ضائع کریں ایک مصرع

پُر ورد اُن کی زبان سے نہ نکلے اُن کا ذکر بھی انشاءاللہ اس سلسلے میں آئیگا۔
بعضے ایسے ہیں۔ کہ اُن سے کلام موزوں پڑھا بھی نہیں جاتا۔ بلکہ انہیں موزوں و ناموزوں میں فرق بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ غضب الٰہی ہے۔ خدا اس سے محفوظ رکھے۔ بعضے شاعر مضمون خوب نکالتے ہیں۔ مگر زبان صاف نہیں کہ بیان بہ فصاحت کر سکیں۔ بعضے ایسے ہیں کہ زبان اُن کی صاف ہے۔ مگر مضامین عالی نہیں۔ چنانچہ ہر ایک کی جگہ پر بجائے خود اشارہ کیا جائیگا۔
یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جوش مضامین اور شگفتگیٔ طبع کے لئے بعض بعض موسم خاص ہیں۔ چنانچہ فصل بہار اور موسم برسات میں طبائع موزوں زیادہ تر شگفتہ ہوتے ہیں۔ بلکہ ناموزوں اور مُردہ دلوں کی طبیعت میں بھی ایک حرکت مذبوحی پیدا ہوتی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ شاعری کے لئے اوقات اور مقامات خاص ہیں۔ اوّل خلوت کہ جہاں ذہن اور طبیعت نہ بٹے خواہ گھر میں گوشۂ عافیت ہو۔ خواہ باغ خواہ صحرا خواہ کنار دریا۔ اور دِل ہمہ تن اُسی میں مصروف ہو۔
اکثر وقت شب کہ جب خلقِ خدا اپنے اپنے کاموں سے تھک کر سو جاتی ہے۔ تب شاعر اپنے کام میں مصروف ہوتا ہے۔ جب تمام عالم سُن سان ہو جاتا ہے۔ تب اس کی طبیعت میں شور پیدا ہوتا ہے۔ جوں جوں رات ڈھلتی جاتی ہے خیال زیادہ تر بلند ہوتا ہے اور مضمون پیرتا جاتا ہے۔ خصوصاً پچھلی رات اور قریب صبح کہ عالم چپ چاپ اور خاطر مطمئن۔ طبیعت صاف۔ ہوا لطیف ہوتی ہے۔ دِل شگفتہ ہوتا ہے۔ مضمون کی کاوش سے دل کو ایک لذّت حاصل ہوتی ہے۔ مضامین عالی طبیعت سے اور الفاظ پر معانی زبان سے منتراوش ہوتے ہیں۔
شاعر کو چاہیئے۔ کہ طبیعت اس کی زیادہ تر قابل اور متأثر ہو مثلِ آبِ رواں کہ جو رنگ اُس میں پڑ جاتا ہے وہی اس کا رنگ ہو جاتا ہے اور جس چیز پر پڑے ویسا ہی رنگ دیتا ہے۔ حالیؔ کی رباعی اس مقام پر مجھے یاد آئی ہے

کعبہ میں بھی ہم نے اُسے جاتے دیکھا	اور دیر میں ناقوس بجاتے دیکھا
شامل ہے بہ ہفتاد و دو ملت مائل	ہر رنگ میں پانی سا سماتے دیکھا

اُس کی اپنی ہی طبیعت کا اثر ہوتا ہے کہ جو مضمون فرحت۔ یا غم۔ رزم یا بزم کا باندھتا ہے جتنی اس کی طبیعت اس سے متاثر ہوتی ہے اُتنا ہی اثر سُننے والے کے دل پر ہوتا ہے۔ دُنیا میں بعضے لوگ ایسے ہیں۔ کہ جب وہ شعر سُنتے ہیں تو دل بے قرار اور طبیعت بے اختیار ہو جاتی ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ ان کا دل مثل آئینہ صاف اور طبیعت اثر پذیر ہے۔ اور بعضے ایسے ہیں کہ اُن کے سامنے اگر طلسمات معنی کے دریا کو شیشہ میں بند کر کے رکھ دو۔ تو بھی انہیں خبر نہ ہو۔ سبب اس کا کدورت دل ہے کہ نور معنی اس میں اثر نہیں کر سکتا۔ روشندلانِ اہلِ درد کے نزدیک طلوع و غروب آفتاب اور انقلاب صبح و شام ہزاروں باغ نو بہار قدرت الٰہی کے شگفتہ کرتا ہے اور تیرہ دلانِ بے خبر کے نزدیک کارگاہ عالم ایک خراس یا دولاب ہے کہ دن رات چکّر میں چلا جاتا ہے +

علم موسیقی کا لطف اور گلزار بوقلموں کی کیفیت ظاہر ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ لیکن جو لوگ بینائی سے محروم یا کانوں سے معذور ہیں وہ بیچارے اُنکے لطفوں سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح جو لوگ لطفِ طبیعت اور صفائیِ دل سے محروم ہیں وہ کیفیت شعر و فصاحتِ کلام سے محروم ہیں اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ بعضی طبائع شعر سے متنفر پائی جاتی ہیں اور دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں۔ اگر فائدہ سے یہی مراد ہے کہ جس کے عمل سے چار پیسے ہاتھ میں آجائیں تو بیشک شعر بالکل کارِ بیفائدہ ہے اور اس میں شک نہیں کہ ابنائے زمانہ نے آج کل شعر کو ایک ایسی ہی حالت میں ڈال دیا ہے لیکن باوجود اس کے بھی جو لوگ طبعِ موزوں رکھتے ہیں اگر زور طبیعت کو علوم اور تواریخ و قصص میں صرف کریں تو فائدہ و کسب دُنیاوی

بھی خاطر خواہ دیوے۔ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اکثر اشخاص علی العموم فنِ شعر کو
گمراہی خیال کرتے ہیں اور فی الحقیقت حال ایسا ہی ہے۔ لیکن جو لوگ سرِ معنی
اور اصلِ سخن کو پہنچے ہوئے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اگر صناع خبثِ طبیعت سے
صنعت کو بُری طرح کام میں لائے تو اصل صنعت پر الزام نہیں آسکتا۔ شیطان نے
معلم الملکوت ہو کر گمراہی اختیار کی۔ پس اس کے لئے ہرگز علم کو ضلالت نہیں کہہ سکتے۔
مسائل فلسفہ و حکمت جن سے اہلِ ہدایت ثبوتِ ذاتِ باری اور تصدیقِ وحدتِ الٰہی
کرتے ہیں اُسی سے اہلِ ضلالت دہر و الحاد پر استدلال کرتے ہیں۔ پس جس طرح سے
ان کی ضلالت سے فلسفہ و حکمت پر الزام نہیں آسکتا۔ اسی طرح شاعروں کی بدزبانی
و بدخیالی سے شعر بھی تہمتِ کفر سے بدنام نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت ایسے کلام کو شعر
کہنا ہی نہیں چاہئے۔ کیونکہ شعر سے وہ کلام مُراد ہے جو جوش و خروش خیالاتِ سنجیدہ
سے پیدا ہوا ہے اور اُسی قوتِ قدسیہ الٰہی سے ایک سلسلہ خاص ہے۔ خیالات
پاک جوں جوں بلند ہوتے جاتے ہیں مرتبۂ شاعری کو پہنچتے جاتے ہیں +

ابتدا میں شعر گوئی حکما اور علمائے متبحر کے کمالات میں شمار ہوتی تھی اور ان
تصانیف میں اور حال کی تصانیف میں فرق بھی زمین و آسمان کا ہے۔ البتہ فصاحت
اور بلاغت اب زیادہ ہے مگر خیالات خراب ہو گئے۔ سبب اس کا سلاطین و حکام عصر
کی قباحت ہے اُنھوں نے جن جن چیزوں کی قدر دانی کی لوگ اس میں ترقی کرتے گئے
ورنہ اسی نظم شعر میں شعرائے اہلِ کمال نے بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ جن کی بنا فقط
پند و اندرز پر ہے اور اُن سے ہدایت ظاہر و باطن کی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض کلام
سعدی و مولوی روم و حکیم سنائی و ناصر خسرو اسی قبیل سے ہیں۔ اُمید ہے کہ جہاں
اور محاسن و قبائح کی ترویج و اصلاح پر نظر ہوگی۔ فن شعر کی اس قباحت پر بھی نظر رہے
گو آج نہیں مگر اُمید قوی ہے۔ کہ انشاء اللہ کبھی نہ کبھی اس کا ثمرۂ نیک حاصل ہو۔ آزاد

تمہاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھیگا	نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے کبھی تو دیکھیگا

بندہ آزاد محمد حسین

نظم اُردو

۸ مئی ۱۸۷۴ء کو نظم اُردو کے عالم میں ایک انقلاب ہوا کہ زبان کی تاریخ میں عمدہ یادگار سمجھا جائیگا۔ نظم مذکور کی آگ ایک چقماق سے نکلی تھی جس کا ایک پُرزہ شعرائے آتش بیاں کی طبع روشن تھی۔ دُوسرا پرزہ امرائے زندہ دل کی گرم طبیعت ایک کی شوخی نے غزل اور قصیدہ کو ولادت دی۔ اور دوسرے کی قدردانی نے اُسے پال کر پرورش کیا۔ مخلوق مذکور اُسی حالت میں بُڑھیا ہو کر اپنی حد سے گزر گئی۔ مختصر یہ کہ وہی معمولی مضمون تھے جو پہلے اُستادوں نے نکالے تھے۔ موجودہ شاعر چبائے ہوئے نوالوں کی طرح انہیں لیتے تھے۔ الفاظ اَدل بَدل کرتے تھے۔ اور پڑھ پڑھ کر آپس میں خوش ہوتے تھے۔ صاحب ڈائرکٹر بہادر نے سال مذکور میں میرے اُستاد پروفیسر آزاد کو ایما فرمایا۔ اُنہوں نے اس مطلب پر مناسب وقت ایک لکچر لکھا۔ اور شام کی آمد اور رات کی کیفیت ایک مثنوی میں دکھائی۔ حضور ممدوح کی تجویز سے ایک تاریخ مقرر ہوئی۔ جلسہ ہوا۔ اہل علم۔ اہل ذوق جمع ہوئے۔ نثر اور نظم مذکور پڑھی گئی۔ اور سب نے صلاح کر کے ایک مشاعرہ قائم کیا۔ کہ شعرا ہر قسم کے مضامین پر طبع آزمائی کیا کریں۔ ۱۱ مہینے تک مشاعرہ قائم رہا۔ اُس وقت نظم مذکور کی شروع پر لوگوں نے کچھ کچھ مخالفت کی۔ مگر ۱۴ برس کے عرصہ میں اتنا اثر ہوا کہ اب ہندوستان کے مشہور شہروں میں ویسی ہی نظموں کی آوازیں آتی ہیں۔ لکچر اور مثنوی مذکور اب نہیں ملتی۔ اور لوگ طلبگار ہیں۔ چونکہ یہ تاریخی مطلب ہے۔ اس کے حرفوں کو مٹنے دینا نہیں چاہیئے۔ اس لئے اس کتاب میں لکچر مذکور کا درج کرنا مصلحت ہے تاکہ نئی نسل کے خیالات میں وسعت پیدا کرے۔

راقم بندہ غلام حیدر نثار شاگرد حضرت آزاد

مضمونِ لکچر

اے حاضرین باتمکین! آج میں ایک ایسے امر پر گفتگو کرنے کو حاضر ہوا ہوں جس میں دخل دینا میری حد سے باہر ہے - کیونکہ وہ حقیقت میں اُس ملک وسیع کی زبان سے متعلق ہے - جسے اہل عالم مملکت ہندوستان کہتے ہیں - اُس کا حال ایسا ہو رہا ہے کہ حب الوطنی کسی طرح خاموش نہیں رہنے دیتی - امر مذکور کیا ہے؟ نظم اور انشا پردازی اُردو زبان کی ہے - جو کہ ہمارے ہر قسم کے ادائے مطلب اور عام تصنیفات اور تفریح طبع کا ذریعہ ہے - اس وقت یہ موقع نہیں کہ زبان ہند کی تحقیق میں کاوش کر کے پُرانی بنیادیں نکالی جائیں - اس لئے یہی کہنا کافی ہے کہ زبان موجودہ ہماری یعنی اُردو زبان حقیقت میں ہندوستان کی برج بھاشا ہے - جس میں فارس کے مسافر نے آ کر عمل دخل کیا - اور صاحب خانہ نے اس بن بُلائے مہمان کو اپنے وسعت اخلاق سے اُس کے خاطر خواہ جگہ دے دی ×

سب جانتے ہیں کہ خود برج بھاشا اپنے عہد میں عام زبان تھی مگر درباروں اور علموں پر ماں کا قبضہ تھا - یعنی سنسکرت کہ جس کی گود میں فصاحت و بلاغت کے دریا لوٹتے تھے - اور برج بھاشا وہ زبان تھی جو کہ گھروں میں کام کاج کی باتوں اور بازاروں میں سودے سلف کے لین دین سے خاص و عام کی ضرورتیں پوری کرتی تھی - چونکہ بھاشا علمی اور تصنیفی زبان نہ تھی - اس واسطے اس میں استعارہ اور تشبیہ سے انشا پردازی کی باریکیاں اس اعلےٰ درجہ پر نہ پہنچیں جو سنسکرت میں ہیں - پھر بھی وہ ہر ایک موقع پر اس خوبی اور خوش اسلوبی سے اپنا مطلب

پورا پورا ادا کرتی تھی۔ جس کی کیفیت کو جاننے والے ہی جانتے ہیں ٭

جب بھاشا سے اُردو پیدا ہوئی۔ تو کئی سو برس تک اُس میں باتیں ہی باتیں رہیں۔ یعنی تحریر اور تصنیف تک نوبت نہ پہنچی۔ لیکن جس طرح کوئی زمین بے روئیدگی کے نہیں رہ سکتی۔ اسی طرح کوئی زبان بے نظم کے نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ پریشان شعر تو کئی سو برس سے اُردو میں چلے آتے تھے۔ جب شاہجہاں کے بعد زبان موجودہ کی عمر سو برس کی ہوئی۔ تو ولی شاعر پیدا ہوئے اور ساتھ ہی جابجا دیوان ترتیب ہونے لگے ٭

اُردو کے مالک اُن لوگوں کی اولاد تھے۔ جو اصل میں فارسی زبان رکھتے تھے۔ اسی واسطے اُنہوں نے تمام فارسی بحریں اور فارسی کے دلچسپ اور رنگین خیالات اور اقسام انشا پردازی کا فوٹوگراف فارسی سے اُردو میں اُتار لیا۔ تعجب یہ ہے کہ اس نے اس قدر خوش ادائی اور خوشنمائی پیدا کی کہ ہندی بھاشا کے خیالات جو خاص اس ملک کے حالات کے بموجب تھے۔ اُنہیں بھی مٹا دیا۔ چنانچہ خاص و عام پپیہے اور کوئل کی آواز اور چنبا چنبیلی کی خوشبو کو بھول گئے۔ ہزار و بلبل اور نسرین و سنبل جو کبھی دیکھی بھی نہ تھیں اُن کی تعریفیں کرنے لگے۔ رستم اور اسفندیار کی بہادری۔ کوہ الوند اور بے ستون کی بلندی۔ جیحون سیحون کی روانی نے یہ طوفان اُٹھایا۔ کہ ارجن کی بہادری ہمالہ کی ہری ہری پہاڑیاں برف سے بھری چوٹیاں اور گنگا۔ جمنا کی روانی کو بالکل روک دیا ٭

اس میں شک نہیں کہ ایک اعتبار سے ہمیں فارسی زبان کا ممنون احسان ہونا چاہیے۔ کہ اُس کی بدولت ہمارے کلام میں بلند پروازی اور جوش و خروش کا زور پیدا ہو گیا۔ اس کے استعارے اور تشبیہوں سے بہت سے نازک اور لطیف خیالات کے ظاہر کرنے کی قوت ہو گئی۔ لیکن چونکہ یہ خیالات فارسی کی نظم و نثر سے آئے ہیں۔ یہاں اُن کے چمن میں باریک باریک استعاروں کی نسیم خوشبو پھیلاتی ہے۔ اور لطیف لطیف تشبیہوں کی شبنم شاداب کرتی ہے۔ اس لئے اُنہیں پھولوں کا عطر اس زبان

میں آیا۔ بے شک اُن کی بلند پروازی اور نازک خیالی جس درجے پر ہے۔ اس کی حد نہیں۔ لیکن اصل مطلب کو ڈھونڈو۔ تو باریکی اور تاریکیِ الفاظ اور استعاروں کے اندھیرے میں ایک جگنو ہے۔ کہ کبھی چمکا اور کبھی غائب *

اے گلشنِ فصاحت کے باغبانو! فصاحت اسے نہیں کہتے۔ کہ مبالغے اور بلند پروازیوں کے بازوؤں سے اُڑتے۔ قافیوں کے پروں سے فرفر کرتے گئے۔ لفاظی اور شوکت الفاظ کے زور سے آسمان پر چڑھتے گئے اور استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئے۔ فصاحت کے معنی یہ ہیں کہ خوشی یا غم کسی شے پر رغبت یا اُس سے نفرت۔ کسی شے سے خوف یا خطر یا کسی پر قہر یا غضب۔ غرض جو خیال ہمارے دل میں ہو۔ اُس کے بیان سے وہی اثر۔ وہی جذبہ۔ وہی جوش سُننے والوں کے دلوں پر چھا جاے۔ جو اصل کے مشاہدہ سے ہوتا۔ بیشک مبالغے کا زور۔ تشبیہ اور استعارے کا نمک۔ زبان میں لطف اور ایک طرح کی تاثیر زیادہ کرتا ہے۔ لیکن نمک اتنا ہی چاہئے کہ جتنا نمک۔ نہ کہ تمام کھانا نمک۔ تشبیہ اور استعارے ہمارے مطلب میں ایسے ہونے چاہئیں۔ جیسے کسی معرکہ یا دربار یا باغ کی تصویر پر آئینہ۔ کہ اُس کی کیفیت کو زیادہ روشن کرے۔ نہ اتنے آئینے کہ تصویر کا اصلی حال ہی نہ دکھائی دے۔ تب اس موقع پر ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ ہمیں چاہئے کہ اپنی ضرورت کے بموجب استعارہ اور تشبیہ اور اضافتوں کے اختصار فارسی سے لیں۔ سادگی اور اظہارِ اصلیت کو بھاشا سے سیکھیں۔ لیکن پھر بھی قناعت جائز نہیں۔ کیونکہ اب رنگ زمانہ کا کچھ اَور ہے۔ ذرا آنکھیں کھولینگے تو دیکھینگے۔ کہ فصاحت و بلاغت کا عجائب خانہ کھُلا ہے۔ جس میں یورپ کی زبانیں اپنی اپنی تصانیف کے گلدستے۔ ہار۔ طرّے ہاتھوں میں لئے حاضر ہیں۔ اور ہماری نظم خالی ہاتھ الگ کھڑی مُنہ دیکھ رہی ہے۔ لیکن اب وہ بھی منتظر ہے کہ کوئی صاحب ہمّت ہو۔ جو میرا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھائے *

اے میرے اہلِ وطن! اس سے یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہاری نظم کو سامانِ آرائش

سے مفلس کہتا ہوں۔ نہیں۔ اُس نے اپنے بزرگوں سے لمبے لمبے خلعت اور بھاری بھاری زیور میراث پائے۔ مگر کیا کرے کہ خلعت پُرانے ہو گئے۔ اور زیوروں کو وقت نے بے رواج کر دیا۔ تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ سے نئے مضامین اور نئے انداز کے موجد رہے مگر نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مُناسب حال ہیں۔ وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں صندوقوں کی کنجی ہمارے ہموطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔ اب مجھے دوسری طرف متوجہ ہونا واجب ہے۔ یعنی اے انگریزی کے سرمایہ دارو! تم اپنے ملک کی نظم کو ایسی حالت میں دیکھتے ہو۔ اور تمہیں افسوس نہیں آتا۔ تُمہارے بزرگوں کی یادگار عنقریب مٹا چاہتی ہے۔ اور تمہیں اس کا درد نہیں آتا۔ اپنے خزانہ اور نئے توشہ خانہ سے ایسا بندوبست نہیں کرتے۔ کہ جس سے وہ اپنی حیثیت درست کر کے کسی دربار میں جانے کے قابل ہو۔ یہ وطن کا فرض ہے کہ قرض سے زیادہ اُس کا ادا کرنا واجب ہے ۔

بھاشا پر جو فارسی نے اثر کیا۔ اور اُس سے نظم اور انشائے اُردو نے ایک خاص لطافت حاصل کی۔ وہ اُن لوگوں کی بدولت ہوئی۔ کہ بھاشا اور فارسی دونوں سے واقف تھے۔ تم خیال کرو کہ جو اُس وقت بھاشا اور فارسی کا حال تھا۔ آج بعینہ اُردو و انگریزی کا حال ہے۔ پس اس کی نظم میں اگر انگریزی کے خیالات کا پرتوہ حاصل ہوگا۔ تو اُنہی لوگوں کی بدولت ہوگا۔ جو دونوں زبانوں سے واقف ہونگے اور سمجھینگے۔ کہ انگریزی کے کون سے لطائف اور خیالات ایسے ہیں۔ جو اُردو کے لئے زیور زیبائش ہو سکتے ہیں ۔

اے میرے اہل وطن! مجھے بڑا افسوس اس بات کا ہے کہ عبارت کا زور مضمون کا جوش وخروش۔ اور لطائف وصنائع کے سامان۔ تمہارے بزرگ اس قدر دے گئے ہیں۔ کہ تمہاری زبان کسی سے کم نہیں۔ کمی فقط اتنی ہے۔ کہ وہ چند بے موقع احاطوں میں گھر کر محبوس ہو گئے ہیں۔ وہ کیا؟ مضامین عاشقانہ ہیں۔ جس میں کچھ

وصل کا لطف۔ بہت سے حسرت وارمان۔ اُس سے زیادہ ہجر کا رونا۔ شراب۔ ساقی۔ بہار۔ خزاں۔ فلک کی شکایت اور اقبالمندوں کی خوشامد ہے۔ یہ مطالب بھی بالکل خیالی ہوتے ہیں۔ اور بعض دفعہ ایسے پیچیدہ اور دُور دُور کے استعاروں میں ہوتے ہیں کہ عقل کام نہیں کرتی۔ وہ اسے خیال بندی اور نازک خیالی کہتے ہیں۔ اور فخر کی موچھوں پر تاؤ دیتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ان محدود دائروں سے ذرا بھی نکلنا چاہیں تو قدم نہیں اُٹھ سکتے۔ یعنی اگر کوئی واقعی سرگزشت یا علمی مطلب یا اخلاقی مضمون نظم کرنا چاہیں تو اس کے بیان میں بدمزہ ہو جاتے ہیں ✦

پس ہمیں اس سے زیادہ کیا افسوس ہوگا۔ کہ ہم اپنے زوروں کو بے اصل اور معدوم باتوں میں ضائع کرتے ہیں۔ اور جواہر کے خزانے کام کی جگہ نہیں لگا سکتے۔ بے جگہ لٹاتے ہیں۔ کیسی حسرت آتی ہے۔ جب میں زبان انگریزی میں دیکھتا ہوں کہ ہر قسم کے مطالب و مضامین کو نثر سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نظم کرتے ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ کلام میں جان ڈالتے ہیں۔ اور مضمون کی جان پر احسان کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں کیا؟ سُن کر ترسیں۔ اپنے تئیں دیکھکر شرمائیں۔ کاش ہم جو ٹوٹی پھوٹی نثر لکھتے ہیں۔ اُتنی ہی قدرت نظم پر بھی ہو جاوے۔ جس کے اعلےٰ درجے کے نمونے انگریزی میں موجود ہیں۔ پھر بھی ہم دیکھتے ہیں۔ ہمارے بزرگ ردیف و قافیہ کے ساتھ ایسی دل پسند بحریں اور نازک خیالیوں کے سامان ہمارے لئے چھوڑ گئے ہیں کہ اگر ہمت کریں تو کسی سے پیچھے نہ رہیں ✦

اے میرے اہل وطن! ہمدردی کی آنکھیں آنسو بہاتی ہیں۔ جب مجھے نظر آتا ہے کہ چند روز میں اس رائج الوقت نظم کا کہنے والا بھی کوئی نہ رہیگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بہ سبب بے قدری کے اَور کہنے والے پیدا نہ ہونگے۔ کئی پُرانی مورتیں باقی ہیں۔ وہ چراغ سحری ہیں۔ انجام یہ کہ زبان ہماری ایک دن نظم سے بالکل محروم ہوگی۔ اور اُردو میں نظم کا چراغ گل ہوگا ✦

میرے اہل وطن! آؤ آؤ۔ برائے خدا اپنے ملک کی زبان پر رحم کرو۔ اُٹھو

اُٹھو - وطن اور اہل وطن کی قدیمی ناموری کو بربادی سے بچاؤ - تمہاری شاعری جو چند محدود احاطوں میں بلکہ چند زنجیروں میں مقیّد ہو رہی ہے - اس کے آزاد کرنے میں کوشش کرو - نہیں تو ایک زمانہ تمہاری اولاد ایسا پائیگی کہ اُنکی زبان شاعری کے نام سے بے نشان ہوگی - اور اس فخر آبائی اور بزرگوں کی کمائی سے محروم ہونا بڑے افسوس کا مقام ہے +

اس میں کچھ شک نہیں کہ سر دست یہ کام کچھ مشکل ہے - کیونکہ ان محدود احاطوں میں جو کچھ موجود ہے - وہ ڈیڑھ سو برس سے آج تک بڑے بڑے سحر البیان فصیحوں نے شام کو صبح اور صبح کو شام کر کے پیدا کیا ہے - دلوں کے خون اور دماغوں کے روغن پسینے کر کے بہائے ہیں - جب یہ دلپسند خیالات یشستہ الفاظ - پاکیزہ ترکیبیں - خوشنما تراشیں - مضمون کی گرمیاں - انداز کی شوخیاں پیدا ہوئی ہیں کہ سُننے والوں کے کانوں میں رس ڈالتی ہیں - اگر کوئی موزوں طبع چاہے کہ عام چیزیں جو آنکھوں کے سامنے ہیں - اُن میں سے جس کو چاہے لے لے - اور اُن پر شاعری خرچ کر کے وہی لطف کلام میں پیدا کر لے - تو آج نہایت مشکل بات ہے - تمام عالم کی تعریفیں اور ہمارے شکریئے ان مزاروں پر پھول برساتے ہیں - جن کے سونے والوں نے اُنہی چھوٹے چھوٹے احاطوں میں وہ کچھ کیا کہ سالہا سال چاہئیں - جو ویسے لوگ پیدا ہوں - ویسی کوششیں کریں - اور ویسے ہی لطیف اور خوش آیندہ انداز عموماً زبان میں پیدا ہوں +

تو بھی ہمیں مایوس ہونا نہ چاہئے - اگر کوشش کرینگے تو ہم بھی کچھ نہ کچھ کر رکھینگے کیونکہ دلّی دِن بھر میں گلزار نہیں ہوگئی تھی - اس سے بڑھکر یہ ہے کہ وہ مضامین جو اب تک اُن احاطوں کو آباد کر رہے ہیں - وہ خود اس قیامت کے مضمون ہیں جن میں شیطان ملعون نے اپنے سارے مزے کوٹ کوٹ کر بھر دئے ہیں - اگر کسی شاعر کی زبان میں قدرتی لذّت کم ہو تو بھی مضامین مذکورہ اپنی گرمی سے رنجک کی طرح شعر کو لے اُڑتے ہیں - البتہ عام مضامین میں ایسی چمک دمک پیدا کرنے کے لئے ایک

قدرتی قوت زبان و بیان اور اصلی فصاحت اعلےٰ درجہ کی چاہیئے۔ تب ہر ایک مضمون کو ویسا ہی گرمائے۔ جس سے سُننے والوں کا دل پھڑک کر لوٹ جائے۔ اگرچہ مدّت سے مجھے اور اکثر اہل وطن کو اس کا خیال ہے مگر اب تقریر میں آنے کا باعث یہ ہے کہ دیکھتا ہوں۔ آج کل ہماری گورنمنٹ اور اُن ارکین کو اس طرف توجہ ہوئی ہے۔ جن کے دل ہماری تعلیم کا ذمہ اُٹھائے ہوئے ہیں۔ حق پوچھو! تو ہماری انشا کے ستارۂ اقبال کی مبارک ساعت ہے۔ اس موقع پر ہماری تھوڑی کوشش بھی بہت سا اثر کریگی ؞

میرے اہل وطن! تمہاری جماعت دو فرقوں سے مرکّب ہے۔ ایک ہندو۔ ایک مسلمان۔ تم جانتے ہو کہ ہندو کون ہیں؟ ہندو وہ ہیں۔ کہ آج ہم جس بات کی آرزو کرتے ہیں۔ وہ اُن کی زبان کا اصلی جوہر ہے۔ اگر بھاشا ہے تو وہ اصلی حالتوں کے ادا کرنے میں سب پر فائق ہے۔ سنسکرت کی قوّت نظم خود حد بیان سے باہر ہے۔ کیونکہ مضامین شاعرانہ درکنار۔ اُس نے تاریخ سے لیکر جغرافیہ۔ طب۔ منطق۔ فقہ تک جس علم کو لیا۔ نظم کی جنتری میں کھینچ لیا۔ دوسرا جزو مسلمان۔ جن کی اصل عرب عربی وہ زبان ہے۔ کہ جس میں مرد تو بالائے طاق۔ گھروں کی عورتیں بلکہ لونڈیاں جب اپنی جوش تقریر پر آتی تھیں تو اُن کا کلام ایک پرزور نظم ہو جاتا تھا۔ کیا یہ افسوس کی بات نہیں۔ کہ ایسے بزرگوں کی اولاد اپنے بزرگوں کی میراثوں سے محروم ہو۔ کیا یہ حیف کی جگہ نہیں کہ آج ہماری زبان حرف تاثیر سے خالی ہو۔ کیا یہ رنج کی جگہ نہیں کہ اَوروں کے سامنے ہماری زبان ضعف بیانی کے ساتھ ہزار نقصوں سے مطعون ہو۔ اے خاک ہندوستان اگر تجھ میں امرءالقیس اور لبید نہیں۔ تو کوئی کالبداس ہی نکال۔ اے ہندوستان کے صحرا و دشت! فردوسی اور سعدی نہیں تو کوئی والمیک ہی پیدا کردو۔ جاننے والے جانتے ہیں۔ کہ شاعری کے لئے اوّل قدرتی جوہر بعد اُس کے چند تخیلی اور علمی لیاقتیں چاہئیں۔ بعد اس کے شوق کامل اور مشق دوامی۔ میں نثر کے میدان میں بھی سوار نہیں۔ پیادہ ہوں۔ اور نظم میں خاک افتادہ۔ مگر سادہ لوحی

تھا دن مگر رہا وہی عالم نگاہ میں
لہراتا پرنیان و حریر سیاہ میں
چمکیگا لشکر اب جو ترا آسمان پر
فرماں نشان میں یہ اُڑیگا جہان پر

تا صبح ہو دے کارگہِ روزگار بند
آرام حکمِ عام ہو اور کار و بار بند

اے رات سُنتا ہوں کہ ترے سر پہ تاج ہے
ہر گوہر اُس میں ملکِ حبشؔ کا خراج ہے
لکھتا ہوں سب حساب پڑھا جاتا کچھ نہیں
ایسا سیاہ ہے کہ نظر آتا کچھ نہیں

اس رنگ پر دکھا رہی کیا آب و تاب ہے
تیرا چمکتا چہرہ سیاہ آفتاب ہے

عالم پہ تو جو آتی ہے رنگ اپنا پھیرتی
ہاتھوں سے مشک اُڑاتی ہے عنبر بکھیرتی
دُنیا پہ سلطنت کا تری دیکھکر حشم
کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم
روئے زمیں پہ جل رہے تیرے چراغ ہیں
اور آسماں پہ کھلتے ستاروں کے باغ ہیں
بجلی ہنسے تو رُخ ترا دیتا بہار ہے
شبنم کو موتیوں کا دیا تو نے ہار ہے

سب تجھ کو لینے آنکھوں پہ ہیں بلکہ جان پر
پُورا ہے تیرا حکم پر آدھے جہان پر

چھائی غرض خدا کی خدائی میں رات ہے
اس وقت یا تو رات ہے یا حق کی ذات ہے
خلقت خدا کی سوتی ہے غافل پڑی ہوئی
اور رات سائیں سائیں ہے کرتی کھڑی ہوئی
سوتا گدا ہے خاک پہ اور شاہ تخت پر
ماہی بزیرِ آب ہے طائر درخت پر
ہے بےخبر پڑا جو بچھونوں پہ گھر میں ہے
دامانِ دشت پر کوئی سوتا سفر میں ہے
گھوڑے پہ اپنے اونگ گیا ہے سوار بھی
چُوکا ہے بلکہ راہزنِ نابکار بھی
القصہ ہے امیر کوئی یا فقیر ہے
عورت ہے یا کہ مرد جواں ہے کہ پیر ہے
بچہ کہ ماں کی گود میں ہے بلکہ پیٹ میں
سب آگئے ہیں نیند کی اس دم لپیٹ میں

جس کو پکارو وہ سوئے خوابِ عدم گیا
دریا بھی اب تو چلنے سے شاید ہو تھم گیا

دیکھو کہ ہر میدان میں دوڑنے کو آمادہ ہوں۔ یہ فقط اس خیال سے ہے کہ میرے وطن کے لئے شاید کوئی کام کی بات نکل آئے۔ میں نے آج کل چند نظمیں مثنوی کے طور پر مختلف مضامین میں لکھی ہیں۔ جنہیں نظم کہتے ہوئے شرمندہ ہوتا ہوں۔ اور ایک مثنوی جو رات کی حالت پر لکھی ہے۔ اس وقت گزارش کرتا ہوں +

مثنوی موسوم بہ شب قدر

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو
عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو

ہیں روز و شب زمانے کے ہمقدم ترے
پیمانے محنتوں کے یہ ہیں بیش و کم ترے

کلفت سے دن کی ہو گیا منہ تیرا زرد ہے
اور ڈالی اس پہ شام نے غربت کی گرد ہے

ہوتا زمانہ بسکہ ہے وابستہ شام سے
اور تو بھی ہے تھکا ہوا دنیا کے کام سے

دامان کوہسار میں اب جا کے سو رہو
دن بھر کا کام شام کو سمجھا کے سو رہو

اے دوست تیرا حکم تھا جاری جہان میں
اور روشنی تھی عام زمیں آسمان میں

جو کچھ کہ تھے سفید و سیہ آشکار تھے
جاری سب اپنی اپنی جگہ کاروبار تھے

دولاب چرخ پر مگر اپنا مدار ہے
چلتا اسی پہ دور خزان و بہار ہے

دن ہے خدا نے ہم کو دیا کام کے لئے
اور رات کو بنایا ہے آرام کے لئے

رخصت ہو تو کہ آئی شب مشک ریز ہے
پھر صبح اٹھ کے چلنا گریزا گریز ہے

آ اے شب سیاہ کہ لیلائے شب ہے تو
عالم میں شاہزادی مشکیں نسب ہے تو

آمد کی تیری شان تو زیب رقم کروں
پر اپنی روشنائی کہاں سے بہم کروں

ہونا وہ بعد شام شفق میں عیاں ترا
اڑنا وہ آبنوس کا تخت رواں ترا

وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر — بیٹھا تھا جس کا سکہ زمیں آسمان پر
کھولے ہوئے شفق کا نشاں زرق و برق سے — رکھکر کرن کا تاج نکلتا تھا شرق سے
اس کے عمل کو توڑنا تیرا ہی کام ہے — سکہ ہے اب ستاروں کا اور تیرا نام ہے

محنت ثمر تھا اس کا تو راحت ہے پھل ترا
چاندی تھا اُس کا حکم تو سونا عمل ترا

مزدور جا بجا تھے جو دُکھ درد پا رہے — اور پاؤں تک سروں کے پسینے بہا رہے
بارِ گراں غریبوں نے سر پر اُٹھائے ہیں — جب چار پیسے شام کو لے گھر میں آئے ہیں

اے شب تمام دن کی مصیبت سے ہار کے
تیرے عمل میں پاؤں ہیں سوئے پسار کے

دن بھر کے ہیں مسافرِ محنت زدہ بہت — آوارہ تا بشام ہیں شامت زدہ بہت
آئے ہیں دن کی دُھوپ میں منزل جو مار کر — رستہ میں بوجھ بھی نہیں رکھا اُتار کر

اے رات تونے ڈالا جو رحمت کا سایہ ہے
اِس وقت اُن بچاروں نے آرام پایا ہے

اس دم امیرزادے کئی بے نظیر ہیں — مسند کے آسمان پہ بدرِ منیر ہیں
دن کا تو رنگ ہو چکا اب رنگ اَور ہے — پردہ میں شب کے بادۂ گلگوں کا دور ہے
اک گلعذار سامنے سرگرمِ ناز ہے — اور جام دے رہی نگہِ نیم باز ہے

کھٹکے لگا کے کمرے میں اب بند ہوتے ہیں
اور وصل کے بچھونے میں پیوند ہوتے ہیں

اکثر امیر لیٹے ہیں نعمت کے ناز میں — پر دل کو اُنکے دیکھو تو ہے سوز و ساز میں
سامان عیش سب ہیں مہیّا کئے ہوئے — جو مانگئے زمانہ ہے حاضر لئے ہوئے

مخمل کا فرش ہے۔ مگر آرام ہی نہیں
جھپکے پلک۔ سو اس کا کہیں نام ہی نہیں

ان کے سوا بھی خلق میں انساں بہت سے ہیں — آرام سے دئے ہوئے ساماں بہت سے ہیں

دِن ہوئے یا ہو رات انہیں کام کچھ نہیں
اور کام ہے تو یہ ہے کہ آرام کچھ نہیں

وہ بھی پڑے ترستے ہیں لطفِ حیات کو
کانٹوں پہ لوٹ لوٹ کے کاٹینگے رات کو

اور اُن کے زیر سایہ پڑا اک غریب ہے
دِن بھر اُٹھاتا بوجھ وہ آفت نصیب ہے
تھا صبحدم کا نکلا ہوا گھر سے کام کو
وہ حق حلال کر کے گھر آیا ہے شام کو
اب اپنی نانِ خشک کو پانی میں چور کر
کھایا ہے اور ست پڑا ہے تنور پر

سر پر قیامت آئے تو اس کو خبر نہیں
سونا تو آنکھ میں ہے مگر پاس زر نہیں

یہ بھی نہ کہنا تم کہ جو آرام عام ہے
وہ سب دِلوں کے واسطے غفلت کا جام ہے
بندے خدا کے ایسے یہاں بے شمار ہیں
دن سے زیادہ رات کو مصروف کار ہیں
کیجے ذرا خیال کہ مُلّائے نکتہ داں
بیٹھا ہے سر جُھکائے بپائے چراغداں
کرتا نظر ہے متن پہ بھی حاشیہ پہ بھی
مضموں جو ہمدگر ہیں اُلجھتے کبھی کبھی
ہر لفظ کو پنھاتا ہے معنی نئے نئے
دکھلانا زور طبع ہے یعنی نئے نئے
لیکن کبھی مقاصدِ اصلی سے چھوٹ کے
کرتا ہے آپ ردّ و قدح جھوٹ موٹ کے

بیٹھا حرام کر کے ہے آرام و خواب کو
کیڑے کی طرح لگ گیا ظالم کتاب کو

ہیں مدرسہ کے طالب علم اپنے حال میں
کل صبح امتحاں ہے۔ سو اسکے خیال میں
مل مل کے یاد کرتے ہیں آپس میں دور سے
پڑھتے جُدا جُدا بھی ہیں کچھ فکر و غور سے
کرلیں جو کچھ کہ کرنا ہے شب درمیان ہے
کل صبح اپنی جان ہے اور امتحان ہے

جی چھوڑ بیٹھے مرد۔ یہ ہمّت سے دور ہے
قسمت تو ہر طرح ہے۔ یہ محنت ضرور ہے

اور وہ جو لکھ پتی ہے مہاجن جہان میں
آدھی بجی ہے پر وہ ابھی ہے دُکان میں
گنتی ہیں دام دام کی ہے دم دئیے ہوئے
بیٹھا ہے گود میں بھی کھاتا لئے ہوئے

ہے سارے لین دین کی میزان تمام کی
لیکن غضب ہے۔ بدھ نہیں ملتی چھدام کی

اور دیکھنا نجومیِ دانا کی شان کو
ہے کس نظر سے دیکھ رہا آسمان کو
اک آنکھ دُوربین پہ ہے اک کتاب پر
ہے محو اپنے زائچہ میں اک حساب پر
کٹتی ہے اس کی تارے ہی گن گن کر تمام رات
پر اب تو فکر ہے یہی دن بھر تمام رات
پیدا ہوئے نئے نئے روشن ضمیر ہیں
نکلے نئے ستارے سرِ چرخ پیر ہیں

اک جنتری بناؤں کہ طرزِ جدید ہو
چمکے جو اُس میں اپنا ستارہ تو عید ہو

اے رات تیرے پردۂ دامن کی اوٹ میں
دُزدِ سیاہ کار بھی ہے اپنی چوٹ میں
بیٹھا نقب لگا کے کسی کے مکاں میں ہے
اور ہاتھ ڈالا اُس کے ہر اک این و آں میں ہے
اسباب سب اندھیرے میں گھر کا ٹٹول کر
ہے چپکے چپکے دیکھ رہا کھول کھول کر

لے جائیگا غرضکہ جو کچھ ہاتھ آئیگا
دیکھو۔ کمایا کس نے ہے اور کون اُڑائیگا

اِس تیرہ شب میں شاعرِ روشن دماغ ہے
بیٹھا اندھیرے گھر میں جلائے چراغ ہے
ڈوبا ہے اپنے سر کو گریباں میں ڈال کے
اُڑتا مگر ہے کھولے ہوئے پر خیال کے
لاتا فلک سے ہے کبھی تارے اُتار کر
جاتا زمیں کی تہ میں ہے پھر غوطہ مار کر
پڑھتا ہے ذرہ ذرہ پہ افسوں نئے نئے
ہو جاتے ہیں وُہی دُرِ مضموں نئے نئے

مضمون تازہ گر کوئی اُس آن مل گیا
یوں خوش ہے جیسے نقش سلیمان مل گیا

اس تیرہ شب کے پردہ میں شاعر جو چور ہے
پھرتا ٹٹولتا ہوا مانند کور ہے
مطلب اُڑاتا شعر سے مضموں غزل سے ہے
لاتا پر ایسے ڈھب سے لفافہ بدل کے ہے

تعریفیں اُس کی کرتے ہیں جو شعر سنتے ہیں
مضموں گیا ہے جن کا وہ سر بیٹھے دھنتے ہیں

عالم ہے اپنے بسترِ راحت پہ خواب میں
آزاد سر جھکائے خدا کی جناب میں
پھیلائے ہاتھ صورت اُمیدوار ہے
اور کرتا صدق دل سے دُعا بار بار ہے
مجھ کو تو ملک سے ہے نہ ہے مال سے غرض
رکھتا نہیں زمانے کے جنجال سے غرض

یارب یہ التجا ہے کرم تو اگر کرے
وہ بات دے زباں پہ کہ دل میں اثر کرے

آجاتی پر کبھی جو ہے شوخی مزاج میں
کرتا ہے اس کو خرچ عدو کے علاج میں
کرجاتا صاف دُشمنِ بد بیں پہ چوٹ ہے
اچھا تو ہے کہ رکھتا نہیں دل میں کھوٹ ہے

کھوٹا اگر زباں کا ہے دِل کا کھرا تو ہے
اِتنا ضرور ہے کہ ذرا مسخرا تو ہے

اے رات یہ جو تو نے سرِ شام آنکر
سجادۂ سیاہ بچھایا ہے تان کر
اور اُس پہ حق پرست کہ یادِ خدا میں ہے
بیٹھا رہِ فنا پہ ہوائے بقا میں ہے
اس کو اُسی کی ذات سے ہے لَو لگی ہوئی
اور دل میں دمبدم ہے تگ و دو لگی ہوئی

کب تک رہے حباب گلا گھونٹ گھونٹ کر
اپنی ہوا میں ایک ہو پھر ٹوٹ پھوٹ کر

دریا میں چل رہا کہیں اس دم جہاز ہے
اہلِ جہاز جن کا خدا کارساز ہے
بیٹھے اُسی کی آس پہ ہیں دل دیئے ہوئے
کچھ حسرتیں ہیں دل میں کچھ ارماں لئے ہوئے
بادِ مراد دیتی ہوائے مراد ہے
پر دل کو بھولتی نہیں طوفاں کی یاد ہے
آنکھیں سبھوں کی لگ رہی ہیں بادبان پر
اور جاتی ہے دُعا کی صدا آسمان پر

یہ سب کے سب ہیں بیٹھے ہوا کی اُمید پر
اے ناخدا تو رہیو خدا کی اُمید پر

دل دے رہا جو شیرِ محبت کے جام ہے
ہاں دیکھو اپنی نیند کو کرتی حرام ہے
ہر چند کام کاج سے ہے گھر کے تھک رہی
بچّہ کو ہاتھ سے ہے برابر تھپک رہی
اور کہتی ہے کہ مجھ کو پڑے یا نہ کل پڑے
ایسا نہ ہو کہ یہ کہیں ڈر کر اُچھل پڑے

ماں کو تو سوتے جاگتے اس کا ہی دھیان ہے
کروٹ نہیں بدلتی کہ ننھی سی جان ہے

پر جائے حیف حال اُسی جاں بلب کا ہے
دن بھر دوا غذا میں رہا غیر حال ہے
بتی چراغ عمر کی ہے جھلملا رہی
اے رات مجھ کو فکر یہی بار بار ہے

سب جس کو کہہ رہے ہیں کہ مہمان شب کا ہے
لیکن ہے اب یہ حال کہ بچنا محال ہے
اور بے کسی سرہانے ہے آنسو بہا رہی
اس کی تو زندگی کوئی دم کا شمار ہے

کون اسکا ساتھ دیویگا ہو صبح جب تلک
روئیگا کوئی شام کے مردے کو کب تلک

آزاد آفریں تری لطفِ زبان کو
سب اپنے اپنے کام میں ہیں دل دیئے ہوئے

ہر کروٹ اب ہے رات نے دی آسمان کو
تو کیوں ہے بیٹھا بادۂ غفلت پیئے ہوئے

کوئی گھڑی تو ہوش و خرد سے بھی کام لے
وقت سحر قریب ہے اللہ کا نام لے

مثنوی موسوم بہ صبحِ اُمّید

جب کیا صبح نے روشن فلکِ مینائی
آنکھ مل کر جو نظر کی سوئے میدانِ جہاں
کام کرتی تھی جہاں تک نگہِ دور انداز
سبز و شاداب تمام ایک طرف دامنِ کوہ
برگ برگ اُس کا ہے آئینہ لئے پیش نظر
آرزوں سے کھلے ہیں گلِ رعنا یکسر
قلۂ کوہ کہ تھا چرخِ بریں سے ہمراز

بسترِ خواب سے میں لے کے اُٹھا انگڑائی
ذرہ ذرہ میں نظر آیا رُخِ جانِ جہاں
تھا کھلا آنکھوں کے آگے چمنِ قدرتِ راز
بس یہ ہے فرش زمیں گلشنِ گردوں کی شکوہ
جن میں ہیں جلوہ نما دل کی مرادوں کے ثمر
جن سے نکلینگے ثمرہائے تمنا یکسر
رکھتا تھا طولِ امل سے بھی سوا راہ دراز

تھی تو ظاہر میں بہت سخت چڑھائی اُسکی
اور مسافت بھی کسی نے نہیں پائی اُسکی

اُس پہ چڑھنے سے مگر تنگ نہ جی ہوتے تھے
دم اُکھڑتے نہ تھے اور سینے قوی ہوتے تھے

گرچہ تھا پاؤں اُٹھانے کا نہ یارا دل کو
کوئی دیتا تھا مگر ایسا سہارا دل کو

کہ چڑھائی جو نظر آرہی تھی دور بہت
دل یہ کہتا تھا کہ ہمت میں ہے مقدور بہت

جشن شاہانہ کا ساماں نظر آتا تھا وہاں
سازِ عشرت کوئی در پردہ بجاتا تھا وہاں

دل اس آواز پہ اس طرح کھچے جاتے تھے
گویا ذرّے سوے خورشید اُڑے جاتے تھے

اس طرف میرا دلِ زار بھی یوں آہ چلا
جیسے بلبل سوے گل کبک سوے ماہ چلا

کاہ کی طرح سوے کاہ رُبا پہنچا میں
الغرض منزلِ مقصود پہ جا پہنچا میں

دیکھا اک باغ کہ قدرت نے لگایا ہے وہاں
گلِ خود رو نے عجب جلوہ دکھایا ہے وہاں

مخملِ سبز سے ہے سبزۂ تر پا انداز
رنگ گل اُس پہ دکھاتے ہیں تماشا انداز

برسرِ کوہ جو پانی کا ہے چشمہ جاری
نہر بن بن کے دکھاتا ہے عجب سرشاری

آب یوں سر ہے بداماںِ جبل مار رہا
سانپ سیماب کا ہو جیسے کہ بل مار رہا

سنگِ مرمر کی لبِ آب جو اک سل ہے پڑی
اُس پہ اک رشکِ پری ہاتھ میں پھولوں کی چھڑی

رنگِ رُخ کو گلِ گلزار سے چمکائے ہوئے
بیٹھی اک پاؤں کو پانی میں ہے لٹکائے ہوئے

اس پہ ہے چتر کی جا سایہ فگن سبز نہال
پھول برساتی ہے پہلو میں کھڑی بادِ شمال

نوجوانانِ چمن بزم سجاتے ہیں کھڑے
فرشِ گلہاے بہاری کا بچھاتے ہیں کھڑے

سر پہ جو اُس کے دھری ہے کلہِ تاجوری
ہے بجاے دُرِ الماس وہ پھولوں سے بھری

اس کے ہر پھول میں لیکن یہ تماشا ہے الگ
کہ ہر اک آنکھ کو رنگ اپنا دکھاتا ہے الگ

اس سے ہر شخص شمیم اپنی جدا لیتا ہے
ہر دماغ اُس سے نئے ڈھب کا مزا لیتا ہے

رُخ جو ہے آئینۂ روے تمنّا اُس کا
شمع ساں چاروں طرف ایک ہے جلوہ اُس کا

اک طرف عقل ہے اک سمت کو تدبیر کھڑی
آگے جامِ مےِ غفلت لیے تاثیر کھڑی

دیتی ہر دل پہ ہے وہ نور سے تنویر جدا
کامیابی کی دکھا دیتی ہے تصویر جدا

رکھتی ہے ایسا اثر نرگسِ جادو اُس کی
پڑ رہی دل پہ نظر ہے جو ہر اک سو اُس کی

ہے ہر اک شخص سمجھتا کہ اشارا ہے مجھے
تڑپ اُٹھتا ہے ہر اک دل کہ پکارا ہے مجھے

اس کے دربار میں ہیں شاہ و گدا آئے ہوئے
اپنے دامانِ تمنّا کو ہیں پھیلائے ہوئے

دمبدم ہے جو نسیمِ سحر آتی جاتی
بوئے اُمّید ہے اِک اِک کو سُنگھاتی جاتی

دِل نے دربار یہ جس وقت دکھایا مجھکو
اور طلسمات کا عالم نظر آیا مجھکو

دیر تک دِل رہا تصویرِ تہِ آئینہ
پر جو تہ بات کی تھی فہم میں وہ آئی نہ

غور کی رازِ نہفتہ میں بہت سی میں نے
شجر چتر پہ لیکن جو نظر کی میں نے

دیکھتا کیا ہوں کہ بیٹھا ہے ہمائے اقبال
دونو پر کھولے ہوئے ہے یہ ہوائے اقبال

دیکھتے ہی مجھے یوں بولا بصد خوشحالی
آؤ آزاد تمہاری ہی جگہ تھی خالی

آؤ تم قید تعلّق سے ہو آزاد بہت
اپنی وارستگیِ دل میں ہو تم شاد بہت

آؤ یاں سایۂ اقبال میں لیویں تُم کو
لاؤ کیا آرزوئے دِل ہے کہ دیویں تم کو

آؤ اس سایہ میں تم ابر گہربار ہے یہ
یعنی شہزادیٔ اُمید کا دربار ہے یہ

اُس کے نغمے سے جو یہ رازِ پُرافسوں نکلا
دل سے بے ساختہ یہ مطلعِ موزوں نکلا

آکہ آباد ترے دم سے ہے دائم دُنیا
اور مثل ہے کہ بااُمید ہے قائم دُنیا

آکہ ہے تیری ہوا میں دِلِ شیدا گلشن
لہلہاتے ہیں تری یاد میں کیا کیا گلشن

دل کے گلشن پہ ہے چھایا ہوا نیرنگ ترا
کونسا پھول ہے جس پر کہ نہیں رنگ ترا

نسا دل ہے کہ جس پر نہ چلے دم تیرا
کون اِنساں ہے خوشی سمجھے نہ جو غم تیرا

سا باغ ہے جس میں کہ صبا تیری نہیں
کونسا گل ہے لگی جس کو ہوا تیری نہیں

نسا دل ہے کہ جس دل میں نہیں چاہ تری
کونسا کوچہ ہے جس میں کہ نہیں راہ (تری)

برقی سے سوا حکم ترا چلتا ہے
دیکھا جس ملک میں واں سکّہ ترا چلتا ہے

آئندہ کا میداں ہے اندھیرا بالکل
غیب نے رنگ سیہ جس پہ ہے پھیرا بالکل

ہیں چلتے تری تدبیر کے ہیں تیر سدا
اُسی میداں میں ہیں پھرتے ترے نخچیر سدا

ذرہ ذرہ سے ترے اُگتے ہیں اشجارِ مراد
خاک میں تیری نظر آتے ہیں گلزارِ مراد

جب ہے کھیتوں میں خزاں آگ لگاتی پھرتی
اور ہوا باغ میں ہے خاک اُڑاتی پھرتی

چشمے خشک اور چمن ہوتے ہیں بے آب پڑے
چاہ بے آب تو ٹوٹے ہوئے دولاب پڑے

پیرِ دہقاں ہے کہیں بے سروساماں بیٹھا
باغباں خاک پہ حیران و پریشاں بیٹھا

ہوتا اُس وقت مُصیبت میں نہیں یار کوئی
نہ مددگار کوئی اور نہ غمخوار کوئی

ہاں مگر تو کہ جب اُس وقت میں آجاتی ہے
جلوہ گر باغِ مراد اس کو دکھا جاتی ہے

ابرِ تر سامنے آنکھوں کے لے آتی ہے کبھی
پھلے پھولے اسے اشجار دکھاتی ہے کبھی

کبھی کھیتوں کو ہرا کر کے دکھا دیتی ہے
کر کے خرمن کبھی انبار لگا دیتی ہے

دمبدم تازہ فسوں آ کے سُناتی ہے اُسے
باغ سبز ایسا غرض اپنا دکھاتی ہے اُسے

تھا جو مایوس پڑا سینہ و سر باندھ کے وہ
اُٹھ کھڑا ہوتا ہے یکبار کمر باندھ کے وہ

دھوپ میں کھاتا ہے بہاتا ہے پسینہ اپنا
کرتا لبریز مرادوں سے ہے سینہ اپنا

ہر مُصیبت میں غرض تو ہے سہارا اُس کا
تیری ہی آس پہ ہوتا ہے گذارا اُس کا

اہلِ ہمت جو ہیں مردانِ تجارت پیشہ
مشغلہ جن کا سیاحت ہے سفر اندیشہ

کوہ و صحرا میں ہیں وہ زادِ سفر باندھے ہوئے
اور چلے جاتے ہیں دن رات کمر باندھے ہوئے

نہ تو پانی کا ہے آرام نہ کھانے کا مزا
اُٹھ گیا ان کے نصیبوں سے زمانے کا مزا

ہر قدم پر بسرِ راہ خطر ہیں لاکھوں
ایک جوکھوں ہے اگر پاس تو ڈر ہیں لاکھوں

خلشِ خار سے ہے دامنِ دل چاک کبھی
صدمۂ یادِ وطن کرتا ہے غمناک کبھی

دل تو ہے سنگِ مصیبت سے شکستہ اُن کا
اور کسی طرح سے کٹتا نہیں رستہ اُن کا

ہر قدم تو ہے مگر اُن کی کمر باندھ رہی
سمتِ مقصود پہ ہے تارِ نظر باندھ رہی

حُسنِ انجام منافع کا دکھاتی ہے کہیں
کرسیاں جاہ و مراتب کی سجاتی ہے کہیں

سامنے جلوۂ اقبال دکھاتی ہے اُنہیں
اور خزانے کہیں پُر مال دکھاتی ہے اُنہیں

کامیابی سے کبھی پھر ہے وطن میں لاتی
آبِ رفتہ کو ہے پھر جوئے چمن میں لاتی

طائرِ دل پر پرواز ہیں پھیلائے ہوئے

اور ترا شوق لئے جاتا ہے دوڑائے ہوئے

گرم ہوتا سرِ میداں ہے جو بازارِ ستیز
ہوتی حملوں سے دلیروں کے ہے آفت برپا
نعرۂ توپ سے شیروں کے ہیں مُنہ مُڑ جاتے
کہیں خنجر کہیں شمشیر نظر آتی ہے
پر وہیں معرکۂ جنگ میں ہے تو آتی
ایسا مستِ مئے جُرأت انہیں کر دیتی ہے
کہ نشا آنکھوں پہ عینک ہے لگاتا گویا
دیتی ہے چشمِ تصوّر میں ہر اک کام دکھا
کہ رُخِ فتح کبھی دیکھتے ہیں گلناری
فتحیابی سے کبھی پھیر کے ہے گھر لاتی
شہرتِ عام کے دربار میں لاتی ہے اُنہیں
نام پر فتح کے نقّارے بجا دیتی ہے
پرچمِ فتح کبھی لا کے ہے لہرا دیتی
نام اک ایک کے نشانوں پہ رقم دیکھتے ہیں
سیکڑوں دورِ فلک سر پہ گزر جائینگے

تیغ خونبار کہیں اور کہیں خنجر خونریز
عرصۂ جنگ میں ہوتی ہے قیامت برپا
بلکہ ہیں گنبدِ نیلی کے دھوئیں اُڑ جاتے
سامنے موت کی تصویر نظر آتی ہے
ہاتھ میں ہے لئے ایک شیشۂ جادو آتی
بلکہ پیمانۂ دل خون سے بھر دیتی ہے
سیرِ فانوسِ خیالی ہے دکھاتا گویا
ہے پھر اُس کام کا دیتی انہیں انجام دکھا
زیبِ سر دیکھتے ہیں تاجِ سپہ سالاری
پیشِ لشکر ہے پہ سرداریٔ لشکر لاتی
فخر و اعزاز کی کُرسی پہ بٹھاتی ہے اُنہیں
شرق سے غرب تک اک دھوم مچا دیتی ہے
فتحیابوں کے ہے سر پر اُسے جلوہ دیتی
اُن کو اس طرح سے شہرت میں علم دیکھتے ہیں
وہ ستارے سے چمکتے ہی نظر آئینگے

دیکھتی چشمِ تصوّر ہے یہ جب باغِ مراد
سر بکف بر سرِ میداں ہیں دلاور آتے
جامِ دل خونِ شجاعت سے چھلک جاتے ہیں
آتے جانباز جو ہیں سر پہ کفن باندھے ہوئے
آبِ شمشیر کو شربت کی طرح پیتے ہیں

اور چمک اُٹھتے ہیں سینوں میں جو ہیں داغِ مُراد
اہلِ جوہر ہیں دکھاتے ہوئے جوہر آتے
نعرۂ اہلِ وغا تا بہ فلک جاتے ہیں
اور ہوائیں بسرِ چرخ کہن باندھے ہوئے
اور جو مرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم جیتے ہیں

خوں دلیروں کے ہیں پانی کی طرح بہ جاتے — اور جگر سینوں میں خوں ہو کے ہیں رہ رہ جاتے
گرم ہو جاتا ہے یہ موت کا بازار وہاں — کہ خریدار پہ گرتا ہے خریدار وہاں
جان و تن موت کے مُنہ کا ہیں نوالا ہوتے — آسماں اور زمیں ہیں تہ و بالا ہوتے
فتحیابی سے بہت چہرے ہیں گلگوں ہوتے — اور بہت تن بسرِ خاک ہیں پُر خوں ہوتے
اے اُمید ایسے ہزاروں ہیں کرشمے تیرے — یونہی بہتے ہیں سدا خون کے چشمے تیرے

ہیں کتب خانۂ ہستی میں بہت صاحبِ علم — اور بہت مدرسۂ دہر میں ہیں طالبِ علم
سوزِ محنت سے بہاتے ہیں پسینے اپنے — حسرتوں سے کئے لبریز ہیں سینے اپنے
نہ تو کھانے کا ہے کچھ فکر نہ پانی کا خیال — ذوقِ راحت ہے نہ ہے لطف جوانی کا خیال
ہو گئے وصل کتابوں میں ہیں وصلی کی طرح — بلکہ پیوندِ ورق ہیں جزءِ اصلی کی طرح
پھرتے دن بھر ہیں کتابیں لئے سودائی سے — ہاتھ اُٹھا بیٹھے اسی شغل میں بینائی سے
تن کو راحت نہیں اور جان کو آرام نہیں — دن ہو یا رات اُنہیں محنت کے سوا کام نہیں
روز و شب خون جگر اپنا جو کھاتے ہیں وہ — اور بلا بارِ مشقت کے اُٹھاتے ہیں وہ
اِن مصائب کی ہے تُو ہی اُنہیں طاقت دیتی — لطف انجام سے ہے حُسن لیاقت دیتی
دیدۂ دل میں لگا دیتی ہے سرمے کیا کیا — دیتی ہے شاہدِ مقصود کو جلوے کیا کیا
اہل تصنیف کو ہے عمرِ دوامی دیتی — بادۂ شوق سے ہے عیش مدامی دیتی
سطحِ کاغذ پہ تو اک باغ کھلا دیتی ہے — برگ و بار اُس میں مرادوں کے لگا دیتی ہے
عوضِ آب ہے دیتی اُسے تو آبِ حیات — اور دکھا دیتی ہے اس طرح سے شادابِ حیات
شہرہ گلزارِ زمانہ میں رہے عام اِن کا — پتے پتے پہ سدا نقش رہے نام اِن کا

کبھی طیار لیاقت کے ہے تمغے کرتی — کہیں ایم۔اے ہے بناتی کہیں بی۔اے کرتی
برسرِ کرسیٔ دربار بٹھاتی ہے اُنہیں — خلعتِ بوقلموں لا کے پنھاتی ہے اُنہیں
بزم کو جلوۂ رنگیں ہے دکھاتی اُن کے — اس طرح فخر سے دامن ہے اُڑاتی اُن کے

ہوتے شاداب ہیں وہ لہلہے فسردہ اُن سے
تازہ دم ہوتے ہیں سب کے دلِ مُردہ اُن سے
کلفتِ محنت و آفت سے ہیں سب جی جاتے
زہر کے گھونٹ ہیں شربت کی طرح پی جاتے

اک مسافر کہ ہے سرگشتہ و حیراں جاتا
دشت پرخار میں ہے بے سروساماں جاتا
نہ کوئی بدرقہ ہے راہ بتانے کے لئے
اور نہ ہے ساتھ کوئی بوجھ بٹانے کے لئے
اس مصیبت میں ستاتی ہے اگر پیاس اُسے
رہتی پھر جان کے بچنے کی نہیں آس اُسے
تپشِ راہ سے جلتا ہے جگر سینہ میں
بُجھ کے رہ جاتا ہے دلِ شُل شرر سینہ میں
دفعۃً آبِ رواں دُور نظر آتا ہے
اور وہ اس لطف سے لہراتا ہوا جاتا ہے
کہ دلِ سوختہ ہے دیکھ کے لہرا جاتا
اور خوشی سے تنِ بےدم میں ہے دم آجاتا
دل جو تھا لوٹ رہا سینہ میں بے آبی سے
جاتا ہے بے سروپا دوڑتا بے تابی سے
جامِ ہمت جو اُسے تونے ہیں پلوائے ہوئے
کوسوں اک دم میں لئے جاتے ہیں دوڑائے ہوئے
زورِ ہمت ہے مگر جتنا بڑھاتی جاتی
اُتنا ہی آگے ہے پانی کو ہٹاتی جاتی

یاس اُس وقت کی لیکن نہ خدا دکھلائے
دلِ مایوس کو جب اُس کے یقیں آجائے
کہ جسے آب سمجھتا تھا نہیں آب ہے یہ
سرِ دریائے فنا موت کا گرداب ہے یہ
یہ سمجھتے ہی اندھیرا ہو جہاں آنکھوں میں
ہوں وہیں موت کے آثار عیاں آنکھوں میں
دل میں ہمت نہ رہی جسم میں حالت نہ رہی
صورتِ نقشِ قدم ہلنے کی طاقت نہ رہی
جان پانی میں ہوا اٹکی ہوئی دم سینہ میں
وہ بھی پر ضعف سے اَگر رہے تھم سینہ میں
اُس گھڑی اپنی کرامات دکھاتی ہے تو
سرِ بالیں وہ مسافر کوئی لاتی ہے تو
حضرتِ خضر کی ہے شان دکھاتا آتا
ہاتھ میں پانی کی چھاگل ہے ہلاتا آتا
اُس کے آجانے سے ہوتی ہے نجات اسکے لئے
ہوتا ہے قطرۂ آب آبِ حیات اسکے لئے

کرتے زاہد جو خدا کی ہیں عبادت دن رات
ترکِ دُنیا سے ہیں سرگرم ریاضت دن رات

ذکرِ فردوس ہی تونے انہیں سنوائے ہوئے
لطف ہردم ہے وہی پیش نظر آئے ہوئے

رند آزاد جو ہردم ہے گرفتارِ گناہ
بارِ عصیاں سے ہے بیچارہ گرانبارِ گناہ

نہیں جُز رحمتِ حق کوئی سہارا اس کا
تیری ہی چشمِ کرم پر ہے گزارا اس کا

تُو نہ ہووے تو تڑپ کر دلِ مضطر رہ جائے
وہ گنہگار تو غم سے ابھی مرکر رہ جائے

رکھتے ہیں شعر و سخن سے جو سروکار سدا
کارِ اربابِ جہاں سے ہیں وہ بیزار سدا

ہے شبِ تار تو سونے سے انہیں کام نہیں
دن کو جُز فکرِ مضامیں کبھی آرام نہیں

لوگ آرام سے ہیں رات کو سویا کرتے
اور یہ بیٹھے دُرِ مضموں ہیں پرویا کرتے

یہ جو ہر لطف سے ہیں ہاتھ اُٹھائے بیٹھے
یا کہ دیوانوں کی صورت ہیں بنائے بیٹھے

باغ سبز اپنے تو ہر لحظہ دکھاتی ہے اُنہیں
مژدۂ خلعت و انعام سُناتی ہے اُنہیں

اُنہیں مطلب نہیں پر اَور کسی بات سے ہے
ہاں غرض ہے تو فقط اتنی تری ذات سے ہے

کہ جو آہ اُن کے دلِ سوختہ جاں سے نکلے
یا کوئی نالۂ موزوں کہ زباں سے نکلے

اثرِ درد سے ناخن بہ جگر ہووے سدا
اور جگر درد سے لبریز اثر ہووے سدا

ہووے اس پر بھی جو آشوبِ جہاں حد سے زیاد
قولِ آزاد سے کرتی ہے انہیں یوں ارشاد

کہ سخن فہم تہِ چرخِ بریں ہوئینگے
خوردہ بیں ہیں تو سخنداں بھی یہیں ہوئینگے

داد مل جائیگی جب اَور کوئی دیکھیگا
آج دیکھا نہ کسی نے تو کبھی دیکھیگا

مثنوی حُبِّ وطن

ہے قولِ جملہ تجربہ کارانِ فارسی
اور رکھتے ہیں یہ نظم نگارانِ فارسی

حبِّ وطن ز ملکِ سلیماں نکوتر است
خارِ وطن ز سنبل و ریحاں نکوتر است

طائرِ دل کا گرچہ یہی حکم عام ہے
اور متّفق اسی پہ زمانہ تمام ہے

پر ملکِ مصلحت کا ہے کچھ انتظام اَور
اس سلطنت کو چاہیئے طرزِ نظام اَور

حبِّ وطن اسے نہیں کہتے کہ باغ سے
نکلے جو گل تو خاک ہو فرقت کے داغ سے

حبِّ وطن نہ یہ ہے کہ پانی میں گر نہ ہو
ماہی کی زندگی کسی صورت بسر نہ ہو

یا ہو گہر جو لوٹ جا دریا کی یاد میں
داخل ہو وہ بھی زمرۂ اہلِ وداد میں

حبِّ وطن اسے بھی نہیں کہتے اہلِ دید
آرام جان و تن کو جو سمجھیں گھروں میں عید

آبِ خنک ہو سامنے اور نان گرم ہو
اور وقت خواب فرش بھی سونے کو نرم ہو

یہ اُلفتِ وطن نہیں ہرگز کہ باغ میں
سودا پکائے بُلبلِ شیدا دماغ میں

آخر شکار دام ہو گلشن کو چھوڑ کر
یادِ چمن میں جان دے سر پھوڑ پھوڑ کر

حبِّ وطن اسے بھی نہیں کہتے اہلِ ہوش
یادِ وطن میں ہووے گہے جوش و گہ خروش

بچوں کی طرح روتے سدا زار زار ہوں
اور مادر و پدر کے لئے بیقرار ہوں

اہل و عیال کا نہ گوارا فراق ہو
اور یار کا فراق بہت دل پہ شاق ہو

حبِّ وطن اسے نہیں کہتے کہ گھر رہیں
بچوں کے مُنہ کو چومتے آٹھوں پہر رہیں

ہے کوئی گود میں کوئی گردن کا ہار ہے
بی بی کہیں میاں کو بہت مجھ سے پیار ہے

روئیں سفر میں دوست گہے یار کے لئے
اور گاہ سیر کوچہ و بازار کے لئے

اے دوست یہ تو دوستیِ سنگ و خشت ہے
یہ دوستی تو خوب نہیں بلکہ زشت ہے

آیا یہ دھیان آج جو وقتِ سحر مجھے
اک نقل یاد آگئی اس اصل پر مجھے

دِلّی کہ جو ہمیشہ سے کانِ کمال ہے
جو باکمال اس میں ہے وہ بے مثال ہے

اِک شخص واں سنار نوازی کی جان تھا
پر جان سے عزیز تھا دلّی کو جانتا

آیا دکن سے خلعت و زر اُس کے واسطے
اور نقد بہر زاد سفر اس کے واسطے

ہر چند مُنہ تو دِلّی سے موڑا نہ جاتا تھا
پر ہاتھ سے یہ مال بھی چھوڑا نہ جاتا تھا

مطلب یہ ہے کہ بعد بہت قیل و قال کے
اسباب سارا راہِ سفر کا سنبھال کے

دلّی کو یہ بھی چھوڑ کے سوے دکن چلے
پر جیسے چھوڑ کر کوئی بلبل چمن چلے

پہنچے مگر ابھی تھے درِ راج گھاٹ پر
جو دفعتہً نظر پڑی دریا کے پاٹ پر

دریا کی لہریں دیکھ کے لہرایا ان کا دل
اور دلّی چھوڑتے ہوئے بھر آیا ان کا دل

منہ پھیر کر نگاہ جو نہی شہر پر پڑی
جلوہ دکھاتی جامع مسجد نظر پڑی

تب وہ پیامبر کہ جو آیا دکن سے تھا
اور اُن کو لے چلا وہ چھڑا کر وطن سے تھا

دیکھا نگاہِ یاس سے اور اس سے یہ کہا
پیچھے چلینگے پہلے مگر یہ تو دو بتا

ایسی تمہارے شہر میں جمنا ہے یا نہیں
منہ دیکھکر وہ ان کا ہنسا اور کہا نہیں

پھر سوے شہر اشارہ کیا اور یہ کہا
مسجد بھی اس طرح کی دکھادوگے واں بھلا

وہ شخص مسکرایا کہ یہ کیا سوال ہے
اس خانۂ خدا کا تو ثانی محال ہے

ہے اپنی طرز میں یہ نرالی جہان سے
اُتری زمیں پہ جسکی شبیہ آسمان سے

یہ بات اس کی سنتے ہی چیں بر جبیں ہوئے
اور بولے خیر ہے کہ روانہ نہیں ہوئے

جمنا نہیں ہے جامع مسجد جہاں نہیں
سنتے بھی ہو میاں ہمیں جانا وہاں نہیں

اپنے دکن کو آپ روانہ شتاب ہوں
پر اس چمن کو چھوڑ کے ہم کیوں خراب ہوں

اور گاڑی اپنی تو بھی میاں گاڑیبان پھیر
گر اب پھرے نہ یاں سے تو قسمت کا جان پھیر

ہم اپنی دلی چھوڑ دکن کو نہ جائینگے
گر یاں بہت نہ کھائینگے تھوڑا ہی کھائینگے

اپنے ہی ننگ حبّ وطن بدنصیب ہیں
گھر میں مسافروں سے جو بدتر غریب ہیں

کہتے ہیں دکھ اٹھانا ہو یا درد سہنا ہو
تھوڑا سا کھانا ہو پہ بنارس میں رہنا ہو

اب میں تمہیں بتاؤں کہ حبِ وطن ہے کیا
وہ کیا چمن ہے اور وہ ہواے چمن ہے کیا

وہ رحمت خدا کہ جو بندوں پہ عام ہے
وہ لطف عام جس سے جہاں شادکام ہے

وہ نور مہر جس سے زمانہ میں نور ہے
وہ نور ذرّہ ذرّہ پہ جس کا ظہور ہے

حبّ وطن ہے جلوہ اُسی نور پاک کا
اور روشن اس کے نور سے عالم ہے خاک کا

طلا تھہر میں یہ نور تو اُس کو کرن کہیں
رکھتا جو سب پہ لطف و کرم کی نگاہ ہو
آوارۂ سفر ہو کہ موجود گھر میں ہو
ہر حال میں رہیں اُسے اہلِ وطن عزیز
حبّ وطن کے ملک میں فرمانروا ہے وہ
اور حبِ وطن کی چاہ تھی یوسف کے سینہ میں
لیکن یہ راز اہلِ حقیقت سے پوچھئے
دل جو گھڑی کی طرح برابر ہے چل رہا
حب الوطن کی راہ میں گرم نفس ہے یہ
یعنی کہ پاؤں اپنے وطن کا پتہ کہاں

گر دل سے جلوہ گر ہو تو حبِ وطن کہیں
اور دل سے ہر بشر کے لئے خیر خواہ ہو
ہاتھ اپنا جیب نفع میں ہو یا ضرر میں ہو
اور ہو وہیں نیک و بد روشِ جان و تن عزیز
تاج و سریر ہو کہ نہ ہو بادشاہ ہے وہ
اس کا تو نقش دیکھ لو دل کے نگینہ میں
اس کا طریق پیرِ طریقت سے پوچھئے
ہر دم وطن کی سمت ہے منزل بدل رہا
نالاں غمِ فراق سے مثلِ جرس ہے یہ
بلبل تھا کس چمن کا میں اور آ پھنسا کہاں

جنّت سے آئے آدم و حوّا زمیں پہ تھے
میراث اپنی گلشنِ جنت کا باغ ہے
پر آفریں ہے حضرتِ انساں کی ذات کو
لیتے وطن پہ قبضہ ہیں دے دے کے جان تلک

رکھتے جو قبضہ گلشن خلدِ بریں پہ تھے
حق ہے اگر فراق سے دل داغ داغ ہے
بھولے نہیں ہیں آج تلک اپنی بات کو
آخر پہنچ ہی رہتے ہیں باغِ جناں تلک

آزاد خیر ہے کدھر آیا خیال ہے
جانا تھا کس طرف کو قدم جا پڑا کہاں
دُنیا زبس کہ مزرعۂ عقبیٰ تمام ہے

تم دیتے کیا جواب ہو اور کیا سوال ہے
تھا ذہن کس خیال میں اور جا لڑا کہاں
سر سبز کرنا اس میں بھی لازم کلام ہے

لکھتے ہیں اس طرح سے مورّخ فرنگ کے
یعنی یورپ کے ملک میں دو تاجدار تھے
کچھ فساد تھا پر ایسا پڑ گیا

دانا رموز معرکہ صلح و جنگ کے
دونوں کے اہل ملک مگر جاں نثار تھے
دونوں کے اتفاق کا نقشہ بگڑ گیا

آخر کو تھے جو واقفِ اسرارِ سلطنت — سمجھے بہم یہ مصلحتِ کارِ سلطنت
دو جاں نثارِ ملک روانہ اُدھر کریں — اور اپنے دو اِدھر کو وہ گرمِ سفر کریں
تا چاروں جس جگہ کہ بہم ایک بار ہوں — سرحد ملک کے وہیں قائم منار ہوں
جانباز اس طرف کے مگر جان توڑ کر — ایسے اُڑے کہ پیچھے ہوا کو بھی چھوڑ کر
اک حصہ طے نہ رستہ حریفوں نے تھا کیا — یہ تین حصہ بڑھ گئے اور اُن کو جا لیا
لیکن حریفِ شرط کے میداں کو چھوڑ کے — بولے یہ عہدِ قول و قرار اپنا توڑ کے
دو اپنے اپنے ملک کے جو جاں نثار ہوں — پھر اب کے دو طرف سے رواں ایکبار ہوں
پر اپنی بات پہلے ہر اک شخص جاں لے — اور یہ ارادہ خوب طرح دل میں ٹھان لے
یعنی جو شرطِ جیت کے خورسند ہوئیگا — سرحد پہ وہ زمین کا پیوند ہووے گا
جانباز آئے تھے جو ابھی راہ مار کے — حب الوطن کے جوش سے بولے پکار کے
جو شرط اب لگائی ہے تم نے یہی سہی — اور بات جو کہ ہونی ہے پھر وہ ابھی سہی
پر بیچ میں نہ حیلہ حوالہ کی آڑ دو — سرحد ہماری ہو چکی بس ہم کو گاڑ دو
حاصل یہ ہے کہ دونوں اسی جا پہ اَڑ گئے — جیتے کے جیتے ملک کی سرحد پہ گڑ گئے

اور ہے لکھا مؤرخِ عہدِ قدیم نے — روما پہ کی جو فوج کشی اک غنیم نے
تیار اہلِ فوج پئے کارزار تھے — پر اہلِ ملک ان سے سوا جاں نثار تھے
آیا حریف جب کہ نہایت قریبِ شہر — اُٹھے برائے جنگ امیر و غریبِ شہر
پر اُن میں کوکلیز جو مردِ دلیر تھا — حبُ الوطن کے حق میں نیستاں کا شیر تھا
نکلا وہ سج کے اسلحہ جنگ اپنے شہر سے — اور لشکرِ عدو کی طرف آیا قہر سے
دو جاں نثارِ حبِ وطن اَور ساتھ تھے — اعدا کے خوں میں ڈوبے سدا جنکے ہاتھ تھے
ہے جیسا بحرِ گنگ کا مائی لقب یہاں — تھے ٹائبر کو باپ کہا کرتے سب وہاں
وہ بحر نیچے شہر کے تھا اوج موج پر — پُل سے اُتر کے آئے یہ دشمن کی فوج پر
پُل کا دہانہ روک کے تیغوں کے گھاٹ سے — اعدا کے خوں بہاتے رہے کاٹ کاٹ سے

اور اپنی فوج کو یہ پکارے کہ آؤ تم
حملہ تو ہم نے روک لیا پل گراؤ تم

مسمار ادھر وہ کرتے رہے پل کو آنکر
یہ تیر و نیزے مارے گئے تان تان کر

پل سارا ٹوٹ ٹوٹ کے دریا میں بہ گیا
اک آدمی کا راہگذر جبکہ رہ گیا

تب کوکلیز یاروں سے بولا کہ جاؤ تم
اے میرے پیارے ہموطنو غم نہ کھاؤ تم

قسمت میں جو لکھا ہو سو ہو ۔ چھوڑ دو مجھے
تم جاؤ اور خدا کے حوالے کرو مجھے

اک اک رفیق جبکہ ادھر پار ہو گیا
اور پل جو کچھ رہا تھا وہ مسمار ہو گیا

للکارا پہلے دشمنوں کو دھوم دھام سے
اور ٹائبر میں کہہ کے یہ کودا دھڑام سے

ٹالا ہے تو نے سر سے عدو کی تباہی کو
اے میرے باپ لیجیو اپنے سپاہی کو

دشمن کی فوج تیغیں سنبھالے ہی رہ گئی
اور موت اپنے دانت نکالے ہی رہ گئی

دیکھو تو فیض حب وطن اس کو کیا ملا
جھٹ چار ہاتھ مار کے یاروں میں جا ملا

گر اس ہوا میں رکھتے ہو دل لالہ زار تم
اور ہو بہ تیغ حب وطن دل فگار تم

ایرانیوں کے عہد کیانی کو دیکھ لو
اس بحر سلطنت کی روانی کو دیکھ لو

کیا کیا مخالفوں سے بچایا ہے ملک کو
کیا کیا عروج دے کے بڑھایا ہے ملک کو

کیا کیا خجل کیا ہے سپہر بنفش کو
کیا کیا شکوہ دی ہے کیانی درفش کو

اعدا کے خوں سے تیغیں ہیں کی آبدار کیں
کیا کیا وطن کے نام پہ جانیں نثار کیں

ان میں بھی سیستاں کے بہادر وہ شیر تھے
جن سے کہ اک جہاں کے زبردست زیر تھے

کرتے تھے عیش دامن کہسار میں کبھی
اور لوٹتے تھے سبزہ گلزار میں کبھی

مثل غزال دشت میں کرتے کلیل تھے
جنگ پلنگ و شیر انہیں بچوں کے کھیل تھے

آب رواں پہ لیتے بہاروں کے لطف تھے
تیر و کماں سے لیتے شکاروں کے لطف تھے

پر سنتے جب کہ شاہ بعزم غنیم ہے
یا یہ کہ اپنے ملک کی حالت سقیم ہے

درد و الم میں ہوں کہ نشاط و سرور میں
ہوں گھر میں یا کہ وادی نزدیک و دور میں

جس حال میں ہوں بے سروپا اٹھ کے دوڑتے
روے زمیں سے مثل ہوا اٹھ کے دوڑتے

اوران میں شان رستم دستاں کی دیکھئے
الفت وطن سے شیر نیستاں کی دیکھئے
وہ جس طرف بپھر کے بشکل بلا چلا
بولی زمیں لرز کے کدھر زلزلا چلا
وہ گرز گاؤ سر کو دھرے قاش زین پر
لنگر کا جس کے صدمہ ہو گاوِ زمین پر
ریشِ دو شاخ دوش ہوا پر اڑی ہوئی
افعی کے پیچ و خم میں وہ موچھیں مڑی ہوئی
فولاد کا وہ خود جو کلہ تھا شیر کا
کرتا فزوں تھا دبدبہ گردِ دلیر کا
بر میں وہ چرم شیر کا خفتاں پھنسا ہوا
اور پائے عزم نافِ زمیں میں دھنسا ہوا
پاکھر پڑی وہ رخش پہ چیتے کی کھال کی
اور دوش پر شکوہ وہ گینڈے کی ڈھال کی
جانا چھڑانے شاہ کو مازندران میں
لڑنا وہ دیو دد سے رہِ ہفت خوان میں
وہ بار بار معرکے افراسیاب سے
ہونا ہمیشہ سینہ سپر انقلاب سے
جب گرم کارزار ہوا خوں بہا دیئے
اور دشمنوں کے خون سے جیحوں بہا دیئے
وہ سیستاں کا شیر عجب کام کرگیا
حب الوطن کے معرکہ میں نام کرگیا

ہر چند شہرہ خلق میں رستم کا عام ہے
اور لیتا آج تک بھی ہر اک اُس کا نام ہے
پر جو وہاں دلاور فرخندہ کام تھے
حب الوطن کے رستم و سنان و سام تھے
جب سُنتے تھے کہ شاہ کہیں گرم جنگ ہے
یا جنگ سے وطن پہ ہوا عرصہ تنگ ہے
سوتے ہوں یا کہ بیٹھے ہوں یا مست خواب ہوں
یا شوق میں شکار کے پا در رکاب ہوں
حب الوطن کے جوش میں ہر کام چھوڑ کر
چاروں طرف سے دوڑتے تھے جان توڑ کر
اور معرکہ میں جنگ کے پھر جوشِ عزم میں
گرز و کمند و تیغ سے میدان رزم میں
لڑتے تھے اور مرتے تھے اور جان کھوتے تھے
اپنے وطن کے نام پہ قربان ہوتے تھے
میدان جنگ جیت کے ہمت کے داؤں میں
لاتے تھے اپنے شاہ کو تیغوں کی چھاؤں میں
چہروں کو رنگ دے کے گلِ نوبہار سے
جاتے تھے گھر کو معرکۂ کارزار سے

حب الوطن ہے نور میں ہمنور آفتاب
اور کرتا ہے ظہور بدستور آفتاب

اس کا بھی روز و شب کی طرح ہیر پھیر ہے
اک جا جو روشنی ہے تو اک جا اندھیر ہے
آج اس کا آفتاب ہے اوجِ فرنگ پر
اور رات ہند کی ہے رُخِ تیرہ رنگ پر
ہے کچھ حساب اَور وہاں کی کتاب کا
رکھتا ورق ورق ہے نشاں آفتاب کا
جانباز ہیں تو بہرِ وطن جاں نثار ہیں
اور تیغ عزم رکھتے سدا آبدار ہیں
قائم ہو تاکہ دبدبہ اہلِ غرور پر
اور بیٹھے سکہ ملک کا نزدیک و دور پر
وہ مال کچھ سمجھتے نہیں نقد و جان کو
دیتے ہیں شان اپنے وطن کے نشان کو

عالم جو علم و فضل کے ہیں جوہری بہت
ہیں دل میں رکھتے مایۂ دانشوری بہت
ٹپکاتے کوششوں کے پسینے جبیں سے ہیں
اور قطرہ قطرہ کرتے بہم ہر کہیں سے ہیں
تا ہو سراب وطن آب جو نصیب
اپنے وطن کے واسطے ہو آبرو نصیب
شائستگی کے ساتھ رواج کمال ہو
علم و ہنر میں اپنا وطن بے مثال ہو

تاجر کہ وہ بھی عقل کے سرمایہ دار ہیں
ہر چند فکر مال میں لیل و نہار ہیں
کھوتے وطن کے نام پہ ہیں مال و جان کو
طے کرتے ہیں بپائے سیاحت جہان کو
لیکن نہ یاد گھر ہے نہ ہے فکر زر انہیں
حب الوطن کا نقش ہے پیش نظر انہیں
کرتے ہیں دانہ دانہ بہم خوشہ خوشے سے
اور ذرہ ذرہ ڈھونڈتے ہیں گوشہ گوشہ سے
چنتے ہیں ساتھ مال کے علم و ہنر کے پھول
تا گلشنِ وطن میں کھلیں سیم و زر کے پھول
دولت کا ہو شگفتہ وطن میں چمن سدا
اور اس سے بہرہ یاب ہوں اہلِ وطن سدا

ایسے بھی اُن میں صاحب بخت و نصیب ہیں
دارالشفائے حبِ وطن میں طبیب ہیں
عالم میں بہر تجربہ پھرتے ہیں گشت کو
اک اک قدم ہیں ناپتے وہ کوہ و دشت کو
ہیں ذرہ ذرہ چھانتے دریا و کان کا
ہیں برگ برگ دیکھتے باغِ جہان کا
ہیں گاہ ڈال میں گہ پات پات میں
ہے غور بات بات کی ذات و صفات میں

اک اک ورق ہیں صورتِ تحریر دیکھتے
اور اس میں برگ برگ کی تاثیر دیکھتے

تا نکلے کوئی تازہ مداوا گزند کا
اور ہو دوائے درد کسی دردمند کا

پران میں وہ ہے زینتِ تاج و نگیں سدا
اور زیب سر ہیں اُس کے گُلِ آفریں سدا

لایا جو بحر و بر کے سفر کو نہ دھیان میں
آیا وطن کو چھوڑ کے ہندوستان میں

فرخ سیر تھا ہند میں فرمانروائے مُلک
اور رغبتِ نسیم و صبا تھی ہوائے مُلک

پر ہند پر تھا حادثۂ غم عجب پڑا
یعنی کہ بادشاہ تھا خود جاں بلب پڑا

اس طرح کا فتور پڑا تھا مزاج میں
تھا مبتلا وہ ایک مرض لاعلاج میں

سب اہلِ عقل ہوش و حواس اپنے کھو چکے
سارے طبیب ہاتھ علاجوں سے دھو چکے

پر اس مسیح دم نے جو آکر کیا علاج
ایسا بحسب طبع موافق پڑا علاج

گویا دوا بکار دُعا ہو گئی اسے
اور تین چار دن میں شفا ہو گئی اُسے

نوبت خوشی کی بج گئی سارے جہان میں
اور جان تازہ آگئی اک اک کی جان میں

فرخ سیر کہ شاہ سخاوت مآب تھا
بحر کرم کا جس کے جھکولا سحاب تھا

اک جشن عام اُس نے کیا دھوم دھام سے
اور شور تہنیت کا اُٹھا خاص و عام سے

حاضر ہوئے امیر و وزیر آکے سامنے
اور اُس طبیب کو کہا بُلوا کے سامنے

لا دامنِ اُمید کہ بھر دیں ابھی اُسے
تا عمر بھر نہ پائے تو خالی کبھی اُسے

دریا دلی طبیب کی دیکھو مگر ذرا
ڈالی نہ اُس نے لعل و گہر پر نظر ذرا

حب الوطن کے جوش سے بیتاب ہو گیا
دل آب ہو کے سینہ میں سیماب ہو گیا

کی عرض ہاتھ جوڑ کے خدمت میں شاہ کی
بندہ کو آرزو نہیں کچھ عز و جاہ کی

زر کی ہوس نہ مال کی ہے جستجو مجھے
پر آرزو جو ہے تو یہی آرزو مجھے

کچھ ایسا میرے واسطے انعام عام ہو
جس سے مرا تمام وطن شاد کام ہو

بولا یہ شاہ اس کا بھی تجھ پر مدار ہے
جو مانگنا ہے مانگ تجھے اختیار ہے

تب عرض کی طبیب نے یوں بادشاہ سے
روشن جلال شاہ ہو خورشید و ماہ سے
تھوڑی زمیں نواحیٔ دریا کنار میں
مجھ کو عطا ہو مملکتِ شہریار میں
تا اس طرف جو میرے وطن کے جہاز آئیں
اور اُن میں تاجران ذوی الامتیاز آئیں
کچھ اُن پہ ہو وے راہ نہ بیم زوال کو
آرام سے اُتاریں یہاں اپنے مال کو
اور جنس جو کہ لائیں وہ نزدیک و دُور سے
محصول سب معاف ہو اُس کا حضور سے

پہلا علاج گرچہ بہت کارگر پڑا
یہ نسخہ لیکن اُس سے سوا پُر اثر پڑا
اُس کی بھی یعنی کلفتِ غم دُور ہو گئی
اور بھی جو کچھ کہ بات وہ منظور ہو گئی
ہر چند اُسے نہ فائدۂ سیم و زر ہوا
پر نفع بہر اہلِ وطن کس قدر ہوا
دامن میں اک عطائے خدا داد پڑ گئی
اور سلطنت کی ہند میں بنیاد پڑ گئی
نوبت بجا کریگی سدا صبح و شام کی
آواز دینگے طبل مگر اُس کے نام کی

اے آفتابِ حبِّ وطن تو کدھر ہے آج
تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن جہاں ہے آنکھوں میں اندھیر ہو رہا
اور انتظامِ دل زبر و زیر ہو رہا
تجھ بن سب اہلِ درد ہیں دل مُردہ ہو رہے
اور دل کے شوق سینوں میں افسردہ ہو رہے
ٹھنڈے ہیں کیوں دلوں میں ترے جوش ہو گئے
کیوں سب ترے چراغ ہیں خاموش ہو گئے
حبِّ وطن کی جنس کا ہے قحط سال کیوں
حیراں ہوں آج کل ہے پڑا اس کا کال کیوں
کچھ ہو گیا زمانے کا اُلٹا چلن یہاں
حب الوطن کے بدلے ہے بغض الوطن یہاں
بن تیرے ملک ہند کے گھر بے چراغ ہیں
جلتے عوض چراغوں کے سینوں میں داغ ہیں
کب تک شبِ سیاہ میں عالم تباہ ہو
اے آفتاب ادھر بھی کرم کی نگاہ ہو
عالم سے تا کہ تیرہ دلی دُور ہو تمام
پنجاب تیرے نور سے معمور ہو تمام
اُلفت سے گرم سب کے دلِ سرد ہوں بہم
اور جو کہ ہموطن ہوں وہ ہمدرد ہوں بہم
تا ہو وطن میں اپنے زر و مال کا وفور
اور مملکت میں دولت و اقبال کا وفور

سب اپنے حاکموں کے لئے جاں نثار ہوں — اور گردنِ حریف پہ خنجر کی دھار ہوں
علم و ہنر سے خلق کو رونق دیا کریں — اور انجمن میں بیٹھ کے جلسے کیا کریں

لبریز جوشِ حُبِّ وطن سب کے جام ہوں
سرشارِ ذوق و شوق دلِ خاص و عام ہوں

مثنوی خوابِ امن

تھک کے خورشید نے دم کل جو سرِ شام لیا — دِل نے بھی کرسیِٔ آرام پہ آرام لیا
میں کہ دن بھر کی مصیبت سے تھکا ماندہ تھا — مکتبِ دید کا پرشائق ناخواندہ تھا
دمبدم دَورِ فلک تازہ سبق تھے گویا — رات دن مجھ کو زمانے کے ورق تھے گویا
شبنمِ امن و اماں سے کبھی شاداب جہاں — اور کبھی شعلۂ آفات سے بیتاب جہاں
بود نابود جو نظروں میں تُلے جاتے تھے — معنیٔ کون و فساد اُس میں کُھلے جاتے تھے
دفعۃً سامنے لیلائے شبِ تار آئی — کرتی ایک اک کو مۓ شوق سے سرشار آئی
گرچہ لائی تھی نہ سامانِ مے و مینوشی کا — ہاتھ میں شیشہ تھا پر داروۓ بیہوشی کا
چال سے سرمۂ حیرت کے غبار اُڑتے تھے — حال سے دیدۂ غفلت کے خمار اُڑتے تھے
ایسے انداز سے دامن تھی ہلاتی آتی — سب کو تھی امن کے سایہ میں سُلاتی آتی
اُس کا جھونکا ہوا غفلت کا حجاب آنکھوں پر — خوابِ شیریں نے کیا کار نقاب آنکھوں پر
خواب گو کارِ جہاں میں خلل انداز ہوا — پر خیالاتِ دلی کو پرِ پرواز ہوا
ذوقِ گلگشت کا اک دے کے اشارہ مجھکو — ایسے گلزاروں میں لے جاکے اُتارا مجھکو
کہ نہ تھا فصلِ بہاری پہ سہارا اُن کا — تھا چمن بندِ طبیعت چمن آرا اُن کا
اُس قلمرو میں رواں تھا قلمِ امن و اماں — پتّے پتّے کے ورق پر رقمِ امن و اماں
پانی نہروں میں پڑا بہتا تھا اور شور نہ تھا — موجیں بھی دست و گریباں تھیں مگر زور نہ تھا

سرکشی سرو سرافراز دکھاتے ہی نہ تھے — سینہ زوری کے بگولے ادھر آتے ہی نہ تھے
زلفِ سنبل کی سیہ تھی پہ سیہ کار نہ تھی — خم تو تھے اُس میں مگر پیچ سے خمدار نہ تھی
سرِ شمشاد کا طرّہ وہاں طرّار نہ تھا — شوخیٔ چشم سے نرگس کو سروکار نہ تھا
دھوپ کا رنگ چمکتا تھا تو ٹل جاتی تھی — اور نسیم آ کے دبے پاؤں نکل جاتی تھی
صبح یہ تاب نہ رکھتی تھی کہ دم مار سکے — یا صبا پاؤں کی آہٹ سے قدم مار سکے
پر جب آتی تو شگوفہ بھی نیا لاتی تھی — ایسا کچھ پھونک کے کانوں میں چلی جاتی تھی
ہنستے تھے پھول پہ کھلتی گرہِ راز نہ تھی — لوٹ جاتے تھے نکلتی مگر آواز نہ تھی
مرغ واں نغمۂ بے صوت و صدا گاتے تھے — اور شجر موجِ ہوا میں پڑے لہراتے تھے
برگ سے برگ و لیکن نہ کھڑک سکتا تھا — خار کی نوک میں دامن نہ اٹک سکتا تھا
لوریاں دیتے تھے نغموں میں پرندے سارے — سوتے آرام سے تھے عیش کے بندے سارے
باغباں قدرتِ حق کا تھا جو آیا اُس جا — تختہ اک تھا گلِ خودرو کا لگایا اُس جا
دامنِ کوہ سے چشمہ جو ہوا تھا جاری — آبِ شیریں سے پڑا کرتا تھا شیریں کاری
اس پہ جھرمٹ میں درختوں کے لبِ جو کی بہار — اور لبِ جو پہ وہیں سبزۂ خودرو کی بہار
شیر بکری وہاں اک گھاٹ تھے پانی پیتے — جامِ الفت تھے بہم دشمنِ جانی پیتے
جلوہ گر بیچ میں ایک قلعۂ شاہنشاہی — گنبدِ امن تھا یا گنبدِ بسم اللہی

در و دربان کی ضرورت تھی نہ زنہار وہاں
پاسبانِ امن کا دن رات تھا ہشیار وہاں

خسروِ امن کا دربار

میں کہ آشوبِ جہاں سے تھا ستم دیدہ بہت — امن کو سمجھا غنیمت دلِ غمدیدہ بہت
شوقِ دل لے کے غرض قصر میں آیا مجھکو — پر عجب عالمِ نیرنگ دکھایا مجھکو
خسروِ امن تھا واں جلوہ فزائے دربار — دیتی فرحت تھی دل و جاں کو ہوائے دربار
اُس کے آگے تھا مرادوں کا چمن پھول رہا — آپ تھا پھولوں کے جھولے میں پڑا جھول رہا

نیند کا جھوکا تھا جھولے کو جھلاتا جاتا — مورچھل سر پہ تھا آرام ہلاتا جاتا

گلِ خورشید تھا واں ہر گلِ شاداب سدا — دھوپ کی جا تھی مگر چادرِ مہتاب سدا

صبح دن رات کھڑی سامنے ہنستی تھی وہاں — نور کے ساتھ سدا اوس برستی تھی وہاں

ہاتھ باندھے تھیں مرادیں وہیں ہر دم آگے — آرزوئیں تھیں کھڑی ناچتی چھم چھم آگے

دولت و عیش و طرب تھے امرائے دربار — کرتے تھے نظم و نسق جملہ بڑے دربار

دل میں افکار پریشاں کا نہ تھا نام وہاں — ہاتھ جمعیتِ خاطر کے تھے سب کام وہاں

مرغزاروں میں جو اشجار تھے سب چھائے ہوئے — دامنِ امن و اماں خلق پہ پھیلائے ہوئے

شغل میں اپنے ہر اک شخص تھا مشغول وہاں
چننا تھا راحت و آرام کے پھل پھول وہاں

علم امن کا شکریہ کرتا ہے

دفعۃً دیکھا کہ اک پیرِ کہن سال آئے — پر عجب شان سے وہ مردِ خوش اعمال آئے

جسمِ پرنور میں پہنے ہوئے جامہ کالا — بر میں جُبّہ عربی سر پہ عمامہ کالا

پاؤں تک شملۂ دستار جو آجاتا تھا — اُن کی مقدارِ فضیلت کو بتاجاتا تھا

لاغری چہرے پہ ہر چند کہ چھائی تھی بہت — رُخ کی عینک نے مگر شان بڑھائی تھی بہت

شانہ تھا ریشِ مقدس میں کیا پیری نے — اور جھکایا تھا بڑھاپے کی زمیں گیری نے

ساتھ کچھ لوگ کتابیں تھے اٹھائے آتے — اور بغل میں کئی جزدان دبائے آتے

سب کے سب پیچھے بصد صدق و صفا آتے تھے — ٹیکتے آپ کرامت کا عصا آتے تھے

الغرض بادشہِ امن کے آگے آئے — پہلے سب نے بادب دستِ دعا پھیلائے

پھر یہ کی عرض کہ آئے ہیں وکالت کے لئے — علم نے بھیجا ہے تقدیمِ رسالت کے لئے

اہلِ تصنیف ہیں تصنیف میں مصروف سدا — ہے ہر اک شہرتِ تعریف سے معروف سدا

اہلِ تحصیل کو پڑھنے کے سوا کام نہیں — اور جہاں میں انہیں فکرِ سحر و شام نہیں

دم بدم علم ہے کرتا عمل ایجاد نئے — آتے ہیں کارگہِ دہر میں اُستاد نئے

درس و تدریس کے چرچے جو ہیں گھر گھر جاری
ہیں یہ جمعیتِ خاطر کی ہی باتیں ساری

جو ہمیں چاہیے موجود ہیں سارے ساماں
ملتے ہیں پہلے ضرورت سے ہمارے ساماں

اے شہِ امن یہ سب فیض کرم تیرے ہیں
کشورِ علم میں سب بھر رہے دم تیرے ہیں

تو نہ ہووے تو ابھی خلق میں طوفاں ہو جائے
سب کا شیرازۂ اوراق پریشاں ہو جائے

زراعت شکریہ کرتی ہے

تھا اُنھوں نے ابھی دفتر نہ سمیٹا اپنا
اور نہ تھا علم نے طومار لپیٹا اپنا

دیکھا انبوہ ہے اک حد سے زیادہ آتا
ہے سوار اُن میں کوئی کوئی پیادہ آتا

گھوڑیاں آگے سواری ہیں بچھیرے پیچھے
اور کئی بیل لئے آتے ہیں گھیرے پیچھے

گود میں ہے کوئی گوسالہ اُٹھائے آتا
کوئی ہل اپنا بغل میں ہے دبائے آتا

نذر کے ٹوکرے کندھوں پہ دھرے آتے ہیں
نئی فصلوں کے اناج ان میں بھرے لاتے ہیں

طُرّے اعزاز کے جن لوگوں نے ہیں پائے ہوئے
بالیں گیہوں کی وہ پگڑی میں ہیں لٹکائے ہوئے

ہمت و عزم میں بوڑھے بھی جواں ہیں اُن کے
تندرستی کے نشاں مُنہ پہ عیاں ہیں اُن کے

دیکھ اُنہیں سب علما ہٹ کے کنارے آئے
بے تکلف سرِ دربار وہ سارے آئے

اور کہا سب نے کہ اے بادشہِ امن و اماں
تجھ سے جاری ہے زمانے میں رہِ امن و اماں

کر کے طے گھر سے بہت فرسخ وہاں آئے ہیں
جانبِ اہلِ زراعت سے وکیل آئے ہیں

کہ وہ صحرا میں جو ہیں بیٹھے سہارے تیرے
آسرے رکھتے ہیں دن رات بچارے تیرے

کھیت پر بیٹھے ہوئے ہیں تو دعا کرتے ہیں
گھر میں ہیں تو ترے شکرانے ادا کرتے ہیں

تو وہ نیساں ہے کہ جس کھیت پہ آجاتا ہے
خاک پر آبِ زمرّد کو بہا جاتا ہے

کشتِ اُمید زمانہ کی ہری ہے تجھ سے
سبز کھیتوں کی سدا گود بھری ہے تجھ سے

پیرِ دہقاں کہ جو ہے سایہ میں تیرے بیٹھا
جان و مال اپنا ہے مٹّی میں بکھیرے بیٹھا

سایۂ امن ترا اُس کو ہرا رکھتا ہے
صرصرِ فتنہ سے محفوظ سدا رکھتا ہے

تو بچاتا ہے زمانے کی لگد کوبی سے
ترکتازانِ حوادث کی پُر آشوبی سے

فیض رحمت ترا ہر لحظہ بڑھاتا ہے اسے | زور تیرا ہے کہ زر کر کے اٹھاتا ہے اسے
کرتا خرمن ہے تو ہی بکھرے ہوئے دانوں کو | تو ہی اک دانے سے ہے پالتا سو دانوں کو

تو نہ ہووے تو ہرے کھیت ہوں پامال تمام
دم میں ہو خلق خدا کال سے بدحال تمام

تجارت شکریہ کرتی ہے

سخن اُن کا نہ سرِ خاتمہ آیا تھا ابھی | اور زراعت نے یہ خرمن نہ اٹھایا تھا ابھی
لوگ کچھ اور بھی آئے پئے تقریر وہاں | دشت و دریا کی لگے کھینچنے تصویر وہاں
گرچہ حال اپنا زباں سے نہ بتاتے تھے وہ سب | مگر انداز سے ایسے نظر آتے تھے وہ سب
کہ ابھی قطع کئے راہ سفر آئے ہیں | ریل سے یا کہ جہازوں سے اُتر آئے ہیں
تھا کوئی دوش پہ خورجین اُٹھائے آتا | اور بغل میں کوئی بیگ اپنا دبائے آتا
رنگ سنولائے ہوئے چہرے تھے گرد آلودہ | دل تھے کلفت زدہ اور سینے تھے درد آلودہ
دشت و دریا کے عجائب تھے وہ ہمراہ لئے | تحفے ہر ملک کے ہاتھوں میں پئے شاہ لئے
خسروِ امن کے دربار میں جب آئے وہ | بعدِ آداب زباں پر یہ سخن لائے وہ
اے شہِ امن دُعا خلق خدا کرتی ہے | اور تجارت ترا شکرانہ ادا کرتی ہے
کہ ترے نظم و نسق سے جو ہیں رستے جاری | شرق سے غرب تلک جنسیں ہیں پہنچتی ساری
ہم اُٹھا لیتے ہیں نفع درم و دام اُن سے | اور جو گھر بیٹھے ہیں وہ پاتے ہیں آرام اُن سے
کاروانوں کے شب و روز جو ہیں تار لگے | کوہ و صحرا میں جہاں دیکھو ہیں بازار لگے
رہے جس جا پہ مسافر کے لئے گھر ہے وہیں | شہرِ گنجشک جو چاہو تو میسر ہے وہیں
نہیں اصلا خطرِ رہزنیِ دہر اُنہیں | ہے ترے فیض سے ہر دشت و جبل شہر اُنہیں
کوئی دم لیتا ہے رستہ میں کوئی سوتا ہے | پر کہیں کیل کا بھی کھٹکا نہیں ہوتا ہے
اے شہِ امن اگر لطف ترا عام نہ ہو | اور تری نظم پہ عالم کا سر انجام نہ ہو

ابھی بازار جہاں زیر و زبر ہو جائے

خانۂ امن و اماں موت کا گھر ہو جائے

صنعت و دستکاری

تھی نہ بات انکی ابھی ختم پہ آنے پائی
اور تجارت پہ دُکاں تھی نہ بڑھانے پائی

لوگ کچھ سامنے سے اور نمودار ہوئے
لیکن اس رنگ سے وہ داخلِ دربار ہوئے

جیسے تختہ ہو گلِ بوقلموں کا آتا
یا چمن ہو کوئی نیرنگ و فسوں کا آتا

خاک پر تھے گلِ ایجاد لگاتے آتے
پھول جھڑتے تھے جو تھے ہاتھ ہلاتے آتے

دستکاری نے کیا لعبتِ چیں تھا اُن کو
رنگ چمکا کے کیا نقش نگیں تھا اُن کو

چشمِ صنعت سے جو تھے کام بنائے اکثر
ضعفِ بینائی سے عینک تھے لگائے اکثر

تھے لئے نذر نہ کچھ گوہر و زر ہاتھوں میں
دستِ صنعت کے تھے گلدستۂ تر ہاتھوں میں

غرض آکر سرِ تسلیم جھکائے سب نے
پیشکش لے کے جو آئے تھے دکھائے سب نے

کر چکے شاہ کا جس دم حقِ نذرانہ ادا
تب کیا جانبِ صنعت سے یہ شکرانہ ادا

اے شہِ امن ہمیشہ ہو یہ دربار کھلا
کہ اسی سائے میں اپنا بھی ہے بازار کھلا

دستکاری کے عمل تجھ سے ہیں سارے چلتے
کام سب تیری بدولت ہیں ہمارے چلتے

تار ہے غیب کے اخبار سنائے جاتا
ریل کا تختِ سلیماں ہے اُڑائے جاتا

کارخانے جو بڑے چلتے ہیں دن رات یہاں
اور کلیں کر رہی جو جو ہیں طلسمات یہاں

اے شہِ امن یہ تیری برکت ہے ساری
تیرے زوروں کی کلوں میں حرکت ہے ساری

دولت شکریہ کرتی ہے

سلسلہ صنع و صناعت کا ابھی تھا جاری
زرِ تقریر پہ تھے کر رہے بینا کاری

دفعتہً چاندنی دربار پہ چھائی یکسر
ہو گئے سب در و دیوار طلائی یکسر

جیسے جھڑتے کبھی گلبن سے ہیں گلزار میں پھول
چاندی سونے کے برسنے لگے دربار میں پھول

کہ پری اتنے میں اک دوش ہوا سے آئی
آئی لیکن عجب انداز و ادا سے آئی

حُسن رفتار سے تھی سرعتِ سیماب اُڑتی
جائے دامن تھی فقط چادرِ مہتاب اُڑتی

حُسن تھا گرچہ حقیقت میں ہوائی اُس کا
پر سراپا تنِ نازک تھا طلائی اُس کا

ٹھوکروں میں تھی زر و سیم اُڑاتی چلتی
باغ نرگس دمِ رفتار کھلاتی چلتی

تھی نہ تھمتی روشِ گردشِ ایام اک جا
لینے دیتی نہ تھی شوخی اُسے آرام اک جا

جب کہ وہ غیرتِ نورِ سحری آ پہنچی
پڑ گئی دھوم کہ دولت کی پری آ پہنچی

سامنے بادشہِ امن کے جس دم آئی
حُسن شکرانہ میں یہ نغمۂ دلکش گائی

کہ جہاں تیری بدولت ہے ہر اک حال میں خوش
ہے کوئی شال میں خوش اور کوئی کھال میں خوش

گھر مہاجن کا جو لاکھوں سے ہے معمور سدا
خوش ہے دو پیسے کی مزدوری میں مزدور سدا

زبردستوں کو ترے سائے میں خوش مستی ہے
اپنا سر پیٹتی ہاتھوں سے زبردستی ہے

ایک کا ایک پہ چل سکتا نہیں زور ذرا
مار گیا تاب جو بل مارے سر مور ذرا

بند و بستوں کو ضرر کچھ نہیں نقصانوں سے
ہاتھ ہیں دستِ درازی کے جدا شانوں سے

ہے ترے نظم و نسق سے جو نظامِ عالم
شربتِ عیش سے معمور ہے جامِ عالم

فتنہ انگیزی غدر و آشوب کی

تھی پری زمزمۂ شکر سے دمساز ابھی
کہ عیاں جانبِ صحرا سے اک آواز ہوئی

وہ صدا سنتے ہی فق ہو گیا دربار کا رنگ
اور ہوا ہو گیا یکسر گل و گلزار کا رنگ

اہلِ دربار کہ تھے بزم جمائے بیٹھے
غم و افکار سے ہاتھ اپنے اُٹھائے بیٹھے

مضطرب ہو کے ہر اک جانب آواز چلا
مرغِ دل میرا ابھی کھولے پر پرواز چلا

چلتے چلتے غرض اک دشت نظر آیا ہمیں
ماجرا دیدۂ عبرت نے یہ دکھلایا ہمیں

یعنی اک مرد دلاور ہے سرِ کوہ کھڑا
اور سرِ کوہ ہے گرد اس کے اک انبوہ کھڑا

تمتمائے ہوئے ہیں دھوپ سے رخسار اُسکے
لال انگارے ہیں دو دیدۂ خونخوار اُسکے

بدن اینٹھا ہوا اُبھرا ہوا سینہ اُس کا | کہ سدا مشق مشقت ہے قرینہ اُس کا
خسروِ امن سے ہے بسکہ بندھی لاگ اُسکی | کودا گھوڑے سے ہے اور پکڑے ہے خود باگ اُسکی
نیزہ ٹیکے ہوئے ہے سب پہ نظر ڈال رہا | ہر نظر سے ہے شرارت کے شرر ڈال رہا
اور یہ کہتا ہے کہ اے امن کے بندو آؤ | آؤ اے راحت و آرام پسندو آؤ
آؤ جلد آؤ کہ ہم مرد بنائیں تم کو | جامِ جرأت خُمِ ہمت سے پلائیں تم کو
کر دیا سلطنتِ امن نے بزدل ہے تمہیں | نہ رکھا عیش و طرب نے کسی قابل ہے تمہیں
رات دن رہتے ہو آرام کے سامانوں میں | دن کو گلشن میں ہو اور شب کو شبستانوں میں
خواب غفلت میں ہو تم پاؤں پسارے سوتے | ہمت و عزم بھی ہیں ساتھ تمہارے سوتے
جُرأت و حوصلہ سے تم کو رہا کام نہیں | ملک میں زور ترقی کا کہیں نام نہیں
خسروِ امن کی خدمت میں زمیں چومتے ہو | رات دن بیٹھے افیمی کی طرح جھومتے ہو
اس عمل نے ہے جوانی میں کیا پیر تمہیں | کیا بے قید ہے وابستۂ زنجیر تمہیں

آؤ اس قید بلا سے تمہیں آزاد کروں | اور ابھی صاحبِ اقبال خدا داد کروں
زورِ بازو سے تم آفاق کو تسخیر کرو | دستِ تقدیر کو وابستۂ تدبیر کرو
عیش نے ہے جو تمہیں جان سے رنجور کیا | ضعفِ دل نے تمہیں ہمت سے ہے معذور کیا
کر دیا امن نے جو عیش کا پابند تمہیں | اور کیا بسترِ راحت کا ہے پیوند تمہیں
میں جہانگیر و جہانگرد کرونگا تمکو | مرد اگر ہو تو جوانمرد کرونگا تم کو
ماپ ڈالوگے انہیں قدموں سے میدانِ جہاں | ایک کر دوگے ابھی دشت و بیابانِ جہاں
اپنے ہر کام کو آرام میں کھویا تم نے | ملک کا نام زمانے میں ڈبویا تم نے
میں ابھی خاک سے افلاک پہ پہنچاؤنگا | مثل خورشید جہاں میں تمہیں چمکاؤنگا
گرچہ تھا خلق میں آشوب جہاں نام اُس کا | فتنہ انگیزیِ عالم تھا سدا کام اُس کا
پر شہِ امن کے بندے تھے جو بھولے بھالے | گنبدِ امن میں آرام سے سونے والے
گرم و سرد اُن پہ زمانے کے نہ گزرے تھے کبھی | گود سے دایۂ راحت کے نہ اُترے تھے کبھی

لایا تھا پیچ میں اپنے نہ کبھی غدر انہیں
اور نہ تھی سلطنتِ امن کی کچھ قدر انہیں

اس کی جانب قدمِ شوق بڑھائے سب نے
اور ادب سے سرِ تسلیم جھکائے سب نے

یعنی ہم تابعِ فرماں ہیں جدھر جائیے آپ
جان تک دینے کو حاضر ہیں جو فرمائیے آپ

ان میں یہ کوتہیِ فہم جو پائی اُس نے
مکر کے ہاتھ کو دی اور رسائی اُس نے

پہلے نزدیک اشارے سے بلایا اُن کو
جھک کے پھر کان میں یہ نکتہ سنایا اُن کو

کہ شہِ امن سے ہو شہر نہ خالی جب تک
ملک پائیگا تمہارا نہ بحالی جب تک

اور مدد اس میں تمہاری بھی ہے درکار ضرور
چاہیئے میری رفاقت تمہیں اک بار ضرور

سب نے سینوں پہ رکھے ہاتھ کہ ہم حاضر ہیں
اور جہاں آپ قدم ماریئے دم حاضر ہیں

یہ سخن سنتے ہی اک قہقہہ مارا اُس نے
اور کیا شہر کی جانب کو اشارا اُس نے

دوڑ کر جست کی اور زینتِ رہوار ہوا
آتشِ فتنہ سے عالم پہ شرر بار ہوا

شہر کی سمت کو رُخ اس نے دلیرانہ کیا
ایسا للکار کے اک نعرۂ شیرانہ کیا

ہل گئے صدمہ سے جسکے طبقِ خاک تمام
تھرتھرانے لگے نہ گنبدِ افلاک تمام

یہ بلا شورِ قیامت جو نمودار ہوا
دفعتہً چونک کے میں خواب سے بیدار ہوا

کھل گئی آنکھ تو تھی شام سیہ فام وہی
وُہی آزاد تھا اور کرسیِ آرام وہی

مثنوی موسوم بہ دادِ انصاف

تھا دلِ آشفتہ جو شب گردشِ ایام سے میں
ہو کے بے خواب اُٹھا بسترِ آرام سے میں

دل تھا حق تلفیوں سے چرخ کی بیزار مرا
اس کے بیداد سے برہم تھا دلِ زار مرا

جاگتے جاگتے وحشت سے جو گھبرایا میں
اور شبِ تار کی تنہائی سے تنگ آیا میں

جیب میں عقل کی کنجی کو ٹٹولا میں نے
اور گنجینۂ خیالات کا کھولا میں نے

وہ کتب خانہ کہ جو علم کا گنجینہ تھا
یا کہ روداد زمانہ کا اک آئینہ تھا

کُتبِ عہدِ قدیم اُس میں سجائی تھیں بہت
عہد آیندہ کی تصویریں لگائی تھیں بہت

بہت اوراقِ پریشاں کہ بہم تھے اُن میں
ماضی و حال کے احوال رقم تھے اُن میں

تھے پڑے دفترِ تاریخ کے اخبار بہت
اور نسب ناموں کے پھیلے ہوئے طومار بہت

اُنہیں اوراق میں اک مجھ کو نسب نامہ مِلا
کہ عجب مخزنِ اسرار سے پُر خامہ مِلا

سربسر تھے رقم احوال نکوفال اُس میں
خاندانِ شہِ انصاف کے تھے حال اُس میں

صدق روشن گہرِ آفاق میں تھا باپ اُس کا
چہرہ پر باپ سے روشن تھا سوا آپ اُس کا

تھا نسب اُس کے بزرگوں کا یقیں سے مِلتا
حق و واقع کا بھی رشتہ تھا یہیں سے مِلتا

ہر شرف کا غرض اس گھر سے پتا ملتا تھا
رفتہ رفتہ یونہی ایمان سے جا ملتا تھا

ماں کی جانب میں دیانت کا تو فرزند تھا وہ
اور امانت کے کلیجے کا جگر بند تھا وہ

دانش و داد نے دودھ اپنا پلایا تھا اُسے
حُسنِ اعمال نے گودوں میں کھلایا تھا اُسے

اُس نے جب ہوش سنبھالا تو بہت شاد ہوئے
ملکِ دل خورمی و عیش سے آباد ہوئے

بعد ازاں مکتبِ تہذیب میں سب لائے اُسے
تاکہ دُنیا کی بھی کچھ عقل ذرا آئے اُسے

یاں ادب نے اُسے شائستہ و دلخواہ کیا
علم نے اُس کو ہر اک راز سے آگاہ کیا

کرچکے علم و ادب جبکہ ادا حق اپنا
اور فضیلت نے کیا نائبِ مُطلق اپنا

ملک القدس کے دربار میں تب لائے اُسے
کہ معزز کبھی اعزاز سے فرمائے اُسے

سرِ دربار بصد حسن و ادب آیا وہ
ایسے آداب سے تسلیم بجا لایا وہ

کہ شہِ قدس اُسے دیکھ کے خورسند ہوا
اور ہر اک حاضرِ دربار رضامند ہوا

دونوں اُستاد و اتالیق تھے ہمراہ آئے
باندھ کر دستِ ادب روبروئے شاہ آئے

کی یہ پھر عرض کہ نو خسرو نورانی ہے
اور تجھے عالمِ بالا کی جہانبانی ہے

چاند یہ اوج حکومت پہ جو چمکا ہے ترے
اے شہِ قدس رہے مدنظر حال اس کا
کہ فزوں مہر سے ہو جائے درخشانی میں
ملتجی آج فقط مہرِ کرم کا ہے ترے
ایسا چمکائیو تو نیّرِ اقبال اس کا
حکم ہو اس کا رواں کشورِ انسانی میں

حال یہ علم و ادب نے جو سب اظہار کئے
اور قیافہ نے بیاں اس کے سب اطوار کئے
خسروِ قدس نے تب موردِ اعزاز کیا
خلعت و عزت و عظمت سے سرافراز کیا
اپنے اعزازِ دوامی کا دیا تاج اس کو
اور دعاؤں سے کیا صاحب افواج اس کو
مشتری نے دیا عزت کا عمامہ اپنا
اور عطارد نے دیا ہاتھ سے خامہ اپنا
لقب خسروِ انصاف اسے ارشاد کیا
اور روانہ بسوئے کشور ایجاد کیا
کہ ہوا ملک فنا ہے جو خرابات تمام
ستم و جور کی ہے چھائی ہوئی رات تمام
جا کے آفاق کو تم نور سے پُر نور کرو
اور خراباتِ جہاں عدل سے معمور کرو

نسخۂ سبز خیالی تھا برِ دست ابھی
اور نظر سلسلۂ شوق سے پابست ابھی
کہ ورق چھوٹ پڑا ہاتھ سے یکبار مرے
نیند نے بند کئے دیدۂ بیدار مرے
چھائے ایسے یہ تصوّر دلِ بیتاب میں تھے
کہ جو تھے دل میں خیالات وہی خواب میں تھے
اس تصوّر نے غرض میرے اڑایا مجھکو
دفعتہً ایسے بیاباں میں لایا مجھکو
وہم شاعر کی جہاں بات بھی پہنچے نہ کبھی
وسعتِ فرضِ محالات بھی پہنچے نہ کبھی

یک بیک عدل کے آثار نمودار ہوئے
اور تمام ارض و سما مطلع انوار ہوئے
بقعۂ نور کا اک تخت ہوادار اُترا
کہ جہانداریٔ عالم کو جہاندار اُترا
تھا جلال اس کے یہ چہرے کی درخشانی میں
چلی جاتی تھی نگہ دیدۂ حیرانی میں
تاب جب تابشِ انصاف کی پائی نہ کہیں
اور ہوئی اس کی تجلی کی سمائی نہ کہیں
پردۂ ابرِ کرم سامنے ڈالے اس نے
مگر اس پردہ میں وہ رنگ نکالے اس نے

کہ اک آرام سا آنے لگا بینائی کو | اور ترقی ہوئی ہر دل کی توانائی کو
عالمِ قدس کے سب پاک نہاد آئے وہاں | بندوبست اُن کو جو درکار تھے فرمائے وہاں
جب کہ ساماں ہوئے سب بزمِ شہنشاہی کے | اور ہوئے نظم و نسق ماہ سے تاماہی کے
توشۂ عدل ہوا جلوہ نمائے عالم | معتدل ہوگئی ہر پہر کی ہوائے عالم
ضعف و قوت بڑھے انداز سے یکساں آگے | اور کھڑی ہوگئی انصاف کی میزاں آگے
رات دن کو یہ ہوا حکم کہ تل جائیں ابھی | نیک و بد جو ہوں زمانہ میں وہ کھل جائیں ابھی
یاس و اُمید کھڑے سامنے مُنہ تکتے تھے | رعب سے شاہ کے پر بات نہ کر سکتے تھے
لی تھی ماں باپ کے وصفوں سے جو تاثیر اُس نے | اور پیا دایۂ دانش کا بھی تھا شیر اُس نے
چہرہ پر رعبِ خداداد برستا تھا پڑا | حُسنِ خلق اُس کا مگر پھول سا ہنستا تھا پڑا
تھامے ہاتھ میں اک تیغ شرربار عجیب | اس کے جوہر کا مگر تھا یہ کچھ اسرار عجیب
کاٹ میں بال کا چھوڑے نہ پس و پیش ذرا | اور نہ ہو تول میں تل بھر کا کم و بیش ذرا
دوسرے ہاتھ میں فانوس فروزاں تھا لئے | یا پئے جور و ستم آتشِ سوزاں تھا لئے
گرچہ فانوس میں تھی اس کے ہر اک بات نئی | نور فانوس میں پر تھی یہ کرامات نئی
یعنی اصلیتِ اشیا کو دکھا دیتا تھا | نیک و بد صورتِ آئینہ بتا دیتا تھا

الغرض خسروِ انصاف کا دربار کھلا | دِل پہ عالم کے درِ دولتِ بیدار کھلا
حق و اثبات چپ و راست وزیر اُسکے ہوئے | ذہن و ادراک و قیاس آکے مشیر اُسکے ہوئے
مصلحت باندھے ہوئے عہد وفا تھی اُس سے | ہوتی تدبیر نہ اک آن جدا تھی اُس سے
قہر اک سمت کو جوں شعلہ بھڑک جاتا تھا | رحم پر آبِ کرم آکے چھڑک جاتا تھا
یُمن و اقبال نے چمکایا وقارِ دربار | اور ہوا عظمت و شوکت پہ مدارِ دربار

کر چکے نظم و نسق آکے جو سب تیاری | تو ہوا پہلے یہ دربار سے فرماں جاری
کہ جو مظلوم ستمدیدہ بچارے ہوویں | اور وہ حق تلفیوں سے ظلم کے مارے ہوویں

بر سرِ وادیِ انصاف ابھی لائیں انہیں
تا کہ تحقیق سے ہم داد کو پہنچائیں انہیں

شہِ انصاف کو یہ بات جو منظور ہوئی
اشتہاروں کی زباں سے وہیں مشہور ہوئی
کی پر اس حکم نے دُنیا تہ و بالا گویا
بلکہ گھر گھر عجب اک تہلکہ ڈالا گویا
پاس اور آس کے اور شادی و ناشادی کے
تھے جو خوف و خطر آبادی و بربادی کے
تو جسے دیکھتی تھی اُس کو لگی تھی اپنی
پڑ گئی تھی غرض اک اک کو اپنی اپنی
تھے جو حق تلفیوں سے لوگ دل افگار تمام
آن کی آن میں مظلوم و ستمگار تمام
ہوئے اس طرح فراہم سرِ میدانِ جہاں
ہو گیا حشر کا میدان بیابانِ جہاں

دوسرا حکم ہوا اور وہاں سے جاری
اور ہوا خلق میں شہرت کی زباں سے جاری
کہ جدا ہوویں ہر اک فرقہ کے اشخاص الگ
تا کہ احکام میں بھی عام سے ہوں خاص الگ

جب کہ تعمیل سے یہ حکم عمل میں آیا
تو گریبانِ ستم دستِ اجل میں آیا
پہلے اک فرقہ طلب برسرِ دربار ہوا
حکمِ دربار اُسے اس طرح سے اظہار ہوا
کہ جو قبضہ میں ہو حقیت و املاک کوئی
نقد یا جنس جہاں ہو تہِ افلاک کوئی
اُس پہ دعوے جسے کچھ ہو وہ بتا دیوے ابھی
اور جو کچھ پاس سند ہو تو دکھا دیوے ابھی
حکم یہ سنتے ہی دوڑے سوے دربار بہت
کُھلے اسناد و فرامین کے طومار بہت
آل تمغا تھے بہ طغرائے سلاطینِ سلف
اور مطلّے و مزیّن تھے بہ آئینِ سلف
بہت اسناد و وثائق کے قبالے آئے
سیکڑوں مہر و شہادت کے حوالے آئے
پر نظر جب شہِ انصاف نے ڈالی اپنی
اور وہیں ہاتھ میں فانوس سنبھالی اپنی
پھر شہادت کوئی پوچھی نہ گواہی دیکھی
اور نہ مہر و توزک دفترِ شاہی دیکھی
جو جو اسناد کہ در پیشیِ انصاف میں تھے
تھے کُھلے یا کہ دھرے گوشۂ اطراف میں تھے
انقلابوں نے زمانہ کے چھپایا تھا انہیں
یا کہیں خوفِ جرائم نے دبایا تھا انہیں

تھے وہیں زیر بغل یا کہ مکانوں میں چھپے
اور مکانوں میں بھی صندوقوں کے خانوں میں چھپے

روشنی پڑتے ہی احوال عیاں ہو گئے سب
جعل کے حرف جہاں تھے وہ دھواں ہو گئے سب

جعلسازوں نے یہ جب دیکھا تو گھبرائے بہم
مکر و تزویر کے پرچے وہیں دوڑائے بہم

آئی دولت بھی مگر اس کی رسائی نہ ہوئی
اور سفارش سے وہاں کارروائی نہ ہوئی

طرفہ تر لطف یہ لیکن سرِ دربار ہوئے
کہ یکایک بدل اقبال سے ادبار ہوئے

بے نوا آئے تھے جو وہ امرا ہو گئے سب
جو امیر الامرا تھے وہ گدا ہو گئے سب

الغرض حق کو پہنچ کر جو یہ حقدار آئے
تو وہ انصاف طلب بر سرِ دربار آئے

کہ خطابوں نے بنایا تھا سرافراز انہیں
دیتی القاب تھی سرمایۂ اعزاز انہیں

ان میں وہ لوگ کہ جو صاحب دیدار بھی تھے
تن پہ چمکائے ہوئے خلعتِ زرتار بھی تھے

خاندانوں کی بزرگی نے بڑھایا تھا انہیں
یا کہ دولت کی ہواؤں نے اُڑایا تھا انہیں

سب سے پہلے وہ قدم مار کے آئے آگے
عَلَمِ فخر جو لائے تھے بڑھائے آگے

پر جب انصاف نے فانوس اُٹھائی اپنی
چاندنی پرتوِ انصاف نے چھائی اپنی

تو وہ گمنام جو عالم میں سدا خوار رہے
اور کئے کارِ نمایاں تو وہ بیکار رہے

اب وہ رُخ پر توِ اعزاز سے چمکانے لگے
ان کے سر پر علم اقبال کے لہرانے لگے

پر جو دربار میں آئے تھے سرافرازی سے
اب بھی باز آئے وہ ظالم نہ فسونسازی سے

لائے تدبیر کو مطلب کی گزارش کے لئے
چٹھیاں لائے بہت اپنی سفارش کے لئے

حق کے آگے نہ مگر پیش کوئی بات گئی
اُن کی جو بات تھی آخر وہ خرافات گئی

اُن کے بعد اور اک انبوہ نمودار ہوا
پر عجب شان سے وہ واردِ دربار ہوا

تھے بہت زیر گلہ نخوتِ شدّاد لئے
اور بہت زیر بغل خنجرِ بیداد لئے

سینہ زوری نے انہیں سینوں میں تھے زور دئے
شور پشتی نے اُنہیں تھے سر پُر شور دئے

سیکڑوں بادۂ دولت کے تھے مخمور اُن میں
اور بہت زور حکومت سے تھے مغرور اُن میں

بادشاہوں کے بھی دربار میں تھی راہ انہیں
اور ہوا خواہ سمجھتا تھا ہر اک شاہ انہیں

ظلم گردوں کی طرح چھائی تھی بیداد اُنکی
کسی دربار میں سُنتے تھے نہ فریاد اُن کی

اُن کے مظلوم کہ تھے ظلم کے مارے سارے
عدل کی آس پہ بیٹھے تھے بچارے سارے

جو ستم اُن پہ ہوئے تھے وہ جتا سکتے نہ تھے
لب تلک نالۂ پر درد کو لا سکتے نہ تھے

پر جو تھا خسرو انصاف کا دربار یہاں
اور نہ تھا رو و رعایت سے سروکار یہاں

یا تو ہر معرکہ میں تھے وہ ستمگار آگے
یاں مگر ہو گئے مظلوم دل افگار آگے

روشنی پڑتے ہی آئینہ ہوئے حال اُن کے
خود بخود کھل گئے سب دفترِ اعمال اُنکے

دست ظلم اپنے ستمگار اُٹھا بھی نہ سکے
بلکہ جو ظلم کئے تھے وہ چھپا بھی نہ سکے

قہر سے کی جو شہِ عدل نے یکبار نگاہ
ہوئی اس طرح سے اُن سب پہ شرر بار نگاہ

کہ جو تھے شیر کی کھالوں میں اکڑتے آئے
اور ہوا سے دم رفتار جھگڑتے آئے

جامے جل جل کے وہ سب انکے سرِ خاک گرے
اور لفافوں سے نکل کر جو وہ بیباک گرے

رعب سے خسرو انصاف کے تھرّانے لگے
سب کے سب صورتِ روباہ نظر آنے لگے

شہِ انصاف نے اُس دم یہ صدا دی سب کو
اور منادی نے وہیں آکے ندا دی سب کو

کہ جو زیر ان سے تھے ابتک وہ دلیر ان پہ رہیں
اور مسلّط وہ سدا صورت شیر ان پہ رہیں

لوگ کچھ زمرۂ اعزاز میں واں اور آئے
پر جو دیکھا تو نظر اُن کے عجب طور آئے

علما و فضلا و بلغا تھے سارے
اور بھرے سر میں فضیلت کی ہوا تھے سارے

تھے بہت جبّہ و عمامہ شالی رکھتے
اور بظاہر تھے مٹاپے کی بحالی رکھتے

روٹیاں مسجدوں میں کھاتے تھے دن رات پڑے
مفت خوری میں بسر کرتے تھے اوقات پڑے

سر پہ دستار مشیخت کی بہت بھاری تھی
اور شکم خالی کتابوں کی اک الماری تھی

تھے مگر ایسے بھی اُن میں زدہ احوال بہت
کہ لگد کوب مشقّت سے تھے پامال بہت

شمع ساں آتش تصنیف میں گھلتے تھے سدا
پھٹے کاغذ کی طرح خاک میں رُلتے تھے سدا

تھے پڑے بند قلمدان میں ناکامی کے
اور نکلتے تو ہدف ہوتے تھے بدنامی کے

پر جو نامنصفیٔ دہر نے مارا تھا اُنہیں
سخت دشوار زمانہ میں گذارہ تھا انہیں

غرض انصاف نے جب پرتو ڈالا اپنا
رنگ تب معنئ اصلی نے نکالا اپنا
مل گئے خاک میں اعزاز خیالی سب کے
جل گئے خلعتِ زرینہ وشالی سب کے

زمرۂ علم میں کچھ اور بھی اشخاص آئے
زہد و تقوے و ارادت سے باخلاص آئے
بسکہ وابستۂ طاعات وعبادات تھے وہ
خلق میں قبلۂ حاجات و مرادات تھے وہ
فقر نے مکر کی تصویر بنایا تھا اُنہیں
خرقہ پوشی نے مرقع میں سجایا تھا اُنہیں
دیتے جاروب سرِ خاک تھے جامے اُنکے
چھتریاں سر پہ لگائے تھے عمامے اُنکے
سب کے سب ہاتھوں میں تسبیحیں ہلاتے آئے
عرض حال اپنے وظیفوں میں سُناتے آئے
کیا پیری نے تھا روشن رُخِ نورانی کو
اور نشاں سجدہ کے چمکاتے تھے پیشانی کو
پارسائی کے یہ دعوے تھے زمانے میں اُنہیں
تا بدربار بھی سو عذر تھے آنے میں اُنہیں
تھے مگر اس پہ بھی اک ایک سے آگے جاتے
اور یہ کہتے سوے دربار تھے بھاگے جاتے
کہ زمانے کا کوئی لطف نہ پایا ہم نے
اور کچھ آرام نہ دُنیا کا اُٹھایا ہم نے
آئے دُنیا کے نہ افسونِ فسانہ میں کبھی
اور ہوئے عیش سے واقف نہ زمانے میں کبھی
آج سجادہ نشینی کا ہو اعزاز ہمیں
کیجئے تاجِ کرامت سے سرافراز ہمیں
جب کرامات یہ اک اک نے سُنائی اپنی
شہِ انصاف نے فانوس ہلائی اپنی
معرفت شمعِ فروزاں لئے یکبار آئی
کرتی اصلیتِ اشیا کو نمودار آئی
مکر و تزویر ہوئے اُڑ کے ہوائی سارے
کُھل گئے زہد خدائی و ریائی سارے
جو یہ کہتے تھے کہ دُنیا سے ہمیں کام نہیں
بلکہ عورت کا کبھی ہم نے سُنا نام نہیں
یاں جو دیکھا تو حریفِ مے و مینا نکلے
اُن کے پہچاننے والے بھی وہیں آ نکلے
یعنی کچھ عورتیں کرتی ہوئی زاری دوڑیں
نان و نفقہ کی طلبگار بچاری دوڑیں
بچے کچھ کہتے ہوئے دوڑے کہ بابا بابا
پر یہ شرمائے کھڑے تھے کہ کہیں کیا بابا
علم کی ذیل میں کچھ لوگوں نے آنا چاہا
بزمِ اعزاز میں رنگ اپنا جمانا چاہا
سندِ علم تو کچھ رکھتے نہ تھے ساتھ اپنے
خونِ معنی سے تھے البتہ بھرے ہاتھ اپنے

قتل مضموں تھا زمانہ میں فقط کام اُن کا
نکتہ چینی سے تھا مشہور جہاں نام اُن کا

گرچہ شورش کے قدم آگے بڑھائے ہوئے تھے
رو سیاہی میں ولے مُنہ کو چھپائے ہوئے تھے

الغرض بڑھ کے وہ جس دم سرِ دربار آئے
لوگ اُنہیں دیکھتے ہی جوش میں یکبار آئے

اور یہ چلائے کہ ہے علم سے کیا کام انہیں
مشغلے اور ہی کچھ ہیں سحر و شام انہیں

کوئی تصنیف ہو اُن کی تو دکھا دیں ذرا
ہو جو تقریر کا دعوےٰ تو سُنا دیں ذرا

سُن کے اس بات کو اُنکے بھی ہوئے کان کھڑے
سامنے تخت کے گھبرا کے ہوئے آن کھڑے

ہو چکے ہوش و حواس اپنے سنبھالے آخر
تھے بغل میں کئی کاغذ وہ نکالے آخر

اور یہ کی عرض کہ لکھنا تو نہیں جانتے ہم
پر مٹانے میں ہیں آندھی کو بھی کم مانتے ہم

یہی باعث ہے کہ فرصت نہیں اک آن ہمیں
اس مرض نے ہے نہایت کیا حیران ہمیں

ورنہ تصنیف کریں ہم تو وہ تصنیف کریں
کہ اُسے آپ بھی گر دیکھیں تو تعریف کریں

سُن کے اس بات کو اک قہقہہ مارا سب نے
اور کہا کاغذوں پر کرکے اشارہ سب نے

کیا خرافات اُٹھا لائے ہو لے جاؤ انہیں
اور کبھی بر سرِ دربار نہ پھر لاؤ انہیں

لوگ اتنے میں بانبوہ کثیر آئے بہت
اہلِ دربار اُنہیں دیکھ کے گھبرائے بہت

تھے کچھ آپس میں وہ کرتے ہوئے تکرار آتے
غل مچاتے ہوئے سب تھے سوئے دربار آتے

اہلِ سیف اہلِ قلم شاملِ حال اُن میں تھے
اور بہت تجربہ کار اہلِ کمال اُن میں تھے

اُن کا غل جبکہ بہت حد سے زیادہ پہنچا
شہ کا تب حکم یہ اک لے کے پیادہ پہنچا

کہ ادب شاہ کا اتنا نہ فراموش کرو
کیوں ہیں غل اتنا مچاتے انہیں خاموش کرو

اہلِ سیف آگے بڑھے تیغ زباں تولے ہوئے
پیشقدمی کے دلائل سے علم کھولے ہوئے

ساتھ ہی اہلِ قلم بولے یہ امکان نہیں
اور یہ آئینِ ادب میں کبھی شایان نہیں

جاہلیت کی حمیت کو نہ یہاں لاؤ تم
علم سے جہل جو بڑھ جائے تو بڑھ جاؤ تم

صاحبِ تجربہ پر اُن میں جو شامل تھے بہت
اور وہ تدبیرِ مہمات میں کامل تھے بہت

بیچ میں آن کے چلائے کہ جانے دو انہیں
گر قدم تم سے بڑھاتے ہیں بڑھانے دو انہیں

کہ یہی سر بھی ہیں میداں میں کٹانے والے
مُلک کے نام کو سر دے کے بڑھانے والے

کیا ہوا ان سے تمہارے جو قدم پیچھے ہیں
سوے دربار تم آگے چلو ہم پیچھے ہیں

حُکم پھر خسروِ انصاف نے اک اور دیا
اشتہاروں نے وہیں آکے اُسے دور دیا

یعنی جو لوگ کہ خواہانِ مناصب ہوویں
اور لیاقت سے مناصب کے مُناسب ہوویں

سامنے خسروِ انصاف کے سب آئیں ابھی
اور جو اسنادِ لیاقت ہوں وہ دکھلائیں ابھی

حکمِ دربار یہ سُن کر بہت اشخاص چلے
کچھ بصد ناز چلے کچھ بصد اخلاص چلے

اُن میں وہ لوگ کہ تھے دعوئِ اعزاز انہیں
قد و قامت کی وجاہت سے بھی تھے ناز اُنہیں

خلعتِ کہنہ بزرگوں کی سجاتے آئے
اور خطاب اُن کی کتابوں سے سُناتے آئے

پر وہ دربار میں جب آئے عدالت کے لئے
اور بڑھے لاف و گزاف اُنکی وکالت کے لئے

تو شہِ عدل نے فانوس کو چمکایا ذرا
نورِ تحقیق نے بھی پرتوا دکھلایا ذرا

کُھل گئی اُن کی حقیقت تو وہ گھبرا کے ہٹے
اور جو تھے آگے بڑھے پیچھے کو شرما کے ہٹے

خسروِ عدل نے تب غور سے سب کو دیکھا
پہلے اک اک کے حسب اور نسب کو دیکھا

جس قدر اہلِ شرافت نظر آئے اُن میں
اور پھر اوصاف لیاقت کے بھی پائے اُن میں

پاس بُلوا کے بہت موردِ اعزاز کیا
اور اُنہیں منصبِ عالی پہ سرافراز کیا

پر اک انبوہِ کثیر اُن میں جو ناکام ہوا
کام کا اُس کے نہ مقصد یہ سرانجام ہوا

شور و فریاد سے کرنے لگا آفت برپا
کیا دربار میں اک شورِ قیامت برپا

ایسے چلّائے کہ میں چونک کے بیدار ہوا
لیکن اس بات سے خوش میرا دلِ زار ہوا

کہ لیاقت سے جو تھے منتخب اشخاص ہوئے
میرے احباب اُن اشخاص میں تھے خاص ہوئے

سامنے جتنے تھے دشمنِ بدکیش مرے
رہے ناکام سب اعدائے بداندیش مرے

مثنوی موسوم بہ وداعِ انصاف

جب طور دمِ صبح شبِ تار کا بدلا
اور رنگ چمن میں گل و گلزار کا بدلا

شبنم نے گہر فرش کئے خاک کے اوپر
اور تارے لگے ڈوبنے افلاک کے اوپر

چلنے کو بہم آنکھ لگے مارنے سارے
اور چاند پہ جانوں کو لگے وارنے سارے

آئی جو صبا لوٹ کے نسرین و سمن میں
انگڑائیاں لینے لگیں شاخیں بھی چمن میں

لی صبح کے پہلو پہ اُدھر رات نے کروٹ
لی خاک پہ یاں مستِ خرابات نے کروٹ

زاہد جو افیمی کی طرح جھوم رہا تھا
اور بیٹھا مصلّے پہ زمیں چوم رہا تھا

بیدار ہوا سُن کے مؤذّن کی اذاں کو
آزاد جو تھا صرفِ سخن کر رہا جاں کو

ہُشیار ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے
اور وقتِ سحر نکلا ہوا کھانے کو گھر سے

تا فیضِ سحر سے ہو دلِ زار شگفتہ
اور ہو کوئی دم جانِ پُر آزار شگفتہ

پر طائرِ دل جب قفسِ شہر سے نکلا
اور قلزمِ افکار کی ہیں لہر سے نکلا

دیکھا کہ سوئے دشت ہے دُنیا چلی جاتی
اور خلق ہے دوڑی سوئے صحرا چلی جاتی

حیرت ہوئی میرے دلِ بے تاب و تواں کو
اور پوچھا ہر اک شخص سے اس رازِ نہاں کو

پر دل کا خلش تھا سو مٹایا نہ کسی نے
اس پردۂ حیرت کو اُٹھایا نہ کسی نے

آخر کو نظرِ عقلِ نظر باز سے لے کر
اور شوق کے بازو پرِ پرواز سے لیکر

پابند برفتارِ زمانہ ہوا میں بھی
ساتھ اُنکے سوئے دشت روانہ ہوا میں بھی

جب شہر کے میدان سے ہم دور تر آئے
اور سامنے راوی کے کنارے نظر آئے

دیکھا کہ سرِ راہ کچھ اشجار ہرے ہیں
دامانِ تمنّا کو طراوت سے بھرے ہیں

ایک شاہ اُسی جا بہ سرِ خاک ہے بیٹھا
بیٹھا ہے مگر سخت غضبناک ہے بیٹھا

اور سامنے کچھ باندھے ہوئے ہاتھ کھڑے ہیں
کچھ برہنہ سر اور کہ جو ساتھ کھڑے ہیں

وہ آکے گرے پاؤں پہ با دیدۂ تر ہیں
اور عفوِ جرائم کو جھکائے ہوئے سر ہیں

پر شاہ نے تلوار کو کھولا ہے کمر سے
اور افسرِ شاہی کو بڑھا ڈالا ہے سر سے
دیکھی جو یہ روداد تو حیران ہوا میں
جب حد سے سوا دل میں پریشان ہوا میں
اک ایک سے پوچھا کہ ہوا واقعہ کیا ہے
اور شہر میں کیا چل گئی وحشت کی ہوا ہے
وہ ہو رہے سب مضطر و ناچار تھے ایسے
اور اپنی مصیبت میں گرفتار تھے ایسے
آتی بھی کسی میں نہ نظر بات کی حالت
تھی بات کی حالت نہ اشارات کی حالت

اک پیرِ کہن اتنے میں نزدیک تر آئے
اور ہوش بھی کچھ اُن کے ٹھکانے نظر آئے
یہ عقدۂ سربستہ رکھا سامنے اُن کے
کھولا یہ معمّا لبِ ناکام نے اُن کے
یعنی کہ ہے یہ شاہ شہنشاہِ مُروّت
تھی اس سے زمانہ میں رواں راہِ مُروّت
اب اس نے جو دیکھا کہ ہے رنگ اور یہاں کا
ایمان ٹھکانے نہ رہا اہلِ جہاں کا
دُنیا میں ہے بگڑی ہوئی ایک ایک کی نیّت
اور خوار ہوئی بد سے فزوں نیک کی نیّت
اس واسطے سب جاہ و حشم چھوڑ کے اپنا
اور سلطنتِ خلق سے مُنہ موڑ کے اپنا
ہے چھوڑنا سب مملکت و مال کو ان کے
تا ان کی سزا سونپ کے اعمال کو ان کے
خود گوشۂ عزلت میں گزارہ کرے اپنا
سر خاک پہ ایک ایک یہاں مارا کرے اپنا

اتنے میں جو تھے لوگ پس و پیش پریشاں
تھے نیک و بد اُن میں بدلِ خویش پریشاں
سب مل کے فراہم ہوئے اور مُتّصل آئے
ہر چند کہ تھے دل میں بہت منفعل آئے
لیکن تھا ہجوم ایسا بکثرت نظر آتا
تھا دل میں تصوّر یہ مرے بیشتر آتا
یا رب یہ زمیں سے ہیں کہ افلاک سے آئے
یا مُردہ نکل کر ہیں تہِ خاک سے آئے

اُس بھیڑ میں آشوب سا اک دفعتہً آیا
یا پانی کا ریلا کہ جو تھا موج زن آیا

جو راس و چپ اُن میں تھے چپ و راس ہوئے سب   ہیں جن میں کھڑا دُور تھا وہ پاس ہوئے سب
پہنچا تھا میں اب فاصلہ پر مدِ نظر کے   کی جب کہ نظر شوق کے شانوں پہ اُبھر کے
دیکھا ہوا اِستاد ہے سلطانِ مروّت   کرتا ہے عیاں حال پریشان مروّت
اب کھولتا ہے تیغ کو ہمت کی کمر سے   اور ہاتھ میں ہے افسرِ شاہی لیا سر سے
گو چشمِ غضبناک سے ہے قہر ٹپکتا   پر لب سے غم و یاس کا ہے زہر ٹپکتا
اور کہتا ہے وہ بادشہِ معدلت اندیش   اِک اِک سے کہ اے فرقۂ ناعاقبت اندیش
بھیجا ملک القدس نے تھا مجھ کو جہاں میں   تا خلق خدا جو ہو زمیں میں کہ زماں میں
ہو دین وہی اُن کا جو ہے دینِ مروّت   اور نظم و نسق ہووے بآئینِ مروّت
آپس کی رفاقت سے چلیں کام سبھوں کے   نیکی سے ہوں مشہور جہاں نام سبھوں کے
پیدا جو خدا نے ہے کیا کون و مکاں کو   اور عالمِ اسباب بنایا ہے جہاں کو
کام ایک پہ ہے ایک کا یاں منحصر ایسا   اور اُن میں بہم سلسلہ باندھا ہے پھر ایسا
جس سلسلہ بندی کی جدائی نہ ہو ممکن   اور ہو کے جُدا کارروائی نہ ہو ممکن
مل جُل کے زمانہ میں گُزارے ہوں سبھوں کے   آپس کی مروّت پہ سہارے ہوں سبھوں کے
اور سب کو سہارا ہو خداوندِ جہاں کا   اُس بن ہو گُزارہ نہ زمیں کا نہ زماں کا

پریاں تو ہیں سب بادۂ نخوت پیئے بیٹھے   دعوے ہیں خدائی کے بغل میں لئے بیٹھے
گُزری ہوئی گردوں سے ہے گردن کشی اُنکی   اور اُس پہ وہ خود رائی و خود مطلبی اُن کی
نیکی پہ سمجھتے ہیں خلائق کی بدی کو   اور دیکھ نہیں سکتے زمانہ میں کسی کو
افسوس کہ رُتبہ مرا جانا نہ کسی نے   اور میں نے جو سمجھایا وہ مانا نہ کسی نے
لیکن جو زمانہ میں یہی کام ہیں ان کے   خود دیکھینگے اِک دن جو کچھ انجام ہیں انکے
ہر چند ہیں آج اہلِ زمانہ مرے دشمن   اور چاہتے ہیں حق کو مٹانا مرے دشمن
پر ہونے دو ان کو جو ہیں سب بر سرِ کیں یہ   جائینگے کہاں بچ کے یہیں ہیں ہوں یہیں یہ

یہ سُن کے ذرا ہوش میں ہر بے خبر آیا
اور اتنے میں اک طرفہ تماشا نظر آیا
دو شخص سرِ معرکہ واں دفعتہً آئے
اور شاہ کے پہلو میں بدرد و محن آئے
سر اپنے جُھکائے ہوئے غمناک تھے دونو
اور درد سے بادیدۂ غمناک تھے دونو
دونو کی وزارت تھی بدربارِ مربّی
اور چلنا انہی دونو سے تھا کارِ مروّت

اک اُن میں کہ تھا برف نے ڈھالا بدن اُس کا
تھا اُس کا بڑھاپا ندی پر بہتی سلیں کا
وہ خلقِ خدا میں تھا جو غمخوار سبھی کا
اور آنکھ سے دُکھ دیکھ نہ سکتا تھا کسی کا
جس پر کوئی صدمہ ہو وہ غم کھاتا تھا گویا
اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گُھلا جاتا تھا گویا
وہ رحم تھا اور رحم سدا کام تھا اُسکا
تمغائے وزارت پہ رقم نام تھا اُس کا

اک دوسرا شخص اَور جو ہمراہ تھا اُس کے
چہرہ پہ برستا حشم و جاہ تھا اُس کے
وہ نسخۂ حیرت بہ نگاہِ عُقلا تھا
اور تن پہ جو کی غور تو کندن سے ڈھلا تھا
کچھ توڑے زرِ نقد کے تھے ہاتھ میں اُس کے
صندوق خزانوں کے تھے کچھ ساتھ میں اُسکے
پر ہاتھ میں توڑے جو پُر از دام و درم تھے
خالی تھے بہت اُن میں بھرے رہ گئے کم تھے
عالم میں سخاوت سے کرم اُس کا لقب تھا
اور بارِ وزارت وہ اُٹھائے ہوئے سب تھا
دُنیا سے کنارہ جو کیا شاہ نے اُس کے
سمجھا یہ مُناسب دلِ آگاہ نے اُس کے
بہرے عملِ خیر کی یاں قدر نہیں ہے
اور دَور بخیلوں کا تہِ چرخِ بریں ہے
ہیں بسکہ بد اندیش پئے خلق خدا یہ
دینا تو جہنم میں گئی دیونگے کیا یہ
دلِ سینۂ گندم سے بھی ہے تنگتر اِن کا
دیتے کو جو دیکھیں تو ہے پھٹتا جگر اِن کا
اب یاں سے چلا شاہِ خوش اقبال ہے اپنا
جو شاہ کا حال اپنے وہی حال ہے اپنا
دونو وہ غرض باندھ کے دستِ ادب آئے
اور اُن کے دلوں سے یہ سخن زیرِ لب آئے
بے شُبہ وفا کا تو یہاں نام نہیں ہے
یہ ملک فنا قابلِ آرام نہیں ہے
افسون و فسانہ پہ یہ دل دادہ ہیں سارے
اور دل میں بغاوت پہ یہ آمادہ ہیں سارے

حضرت نے جو تجویز کیا عین بجا ہے
پر شاہ سے یہ عرض نمکخوار ہیں کرتے
گو اہلِ جہاں پھیرے ہیں رُخ راہِ وفا سے
پر ایسے بھی موجود ہیں اشخاص جہاں میں
سلطانِ مروّت کو ہیں جو شاہ سمجھتے
یہ وضع زمانے کی خوش آئی نہیں اُن کو
باقی نہیں دُنیا کی ہوس کوئی رہی ہے
ہم یعنی کہ ہیں شاہ کے شرمندۂ احساں
جو جو کہ شرف پائے ہیں اس فیض کرم سے
اک بار مگر سامنے ہوں شاہ کے اپنے
وہ رنگ میں شکریہ کے اس آن نکالیں

اب یہ رہیں گمراہ یہی ان کی سزا ہے
اور مصلحتِ وقت کو اظہار ہیں کرتے
اور باندھے ہیں پیمانِ وفا مکر و دغا سے
اور جوہرِ اخلاص سے ہیں خاص جہاں میں
اور شاہ کو ہیں سایۂ اللہ سمجھتے
ان قدموں سے منظور جُدائی نہیں اُن کو
اب اُن کو تمنّا جو رہی ہے تو یہی ہے
اور بندۂ حق وہ ہے جو ہے بندۂ احساں
شکر اُن کے ادا کچھ نہیں ہو سکتے ہیں ہم سے
اور جوش جو ہیں جان ہوا خواہ کے اپنے
اور سینوں میں جو کچھ ہیں وہ ارمان نکالیں

جب لب پہ یہ اُن کے سخنِ پر اثر آئے
گزرے دلِ غمگیں پہ خیالات ہزاروں
کچھ بعد تأمّل کے مگر اُن سے کہا یہ
گو روکنا میرا دلِ مجبور ہے مجھکو
دی جبکہ اجازت شہِ فرخندہ لقب نے
پابند مروّت جو کچھ اشخاص تھے اُن میں
ہر سمت سے وہ فرقہ بفرقہ ادھر آئے

اس شاہ کی آنکھوں میں بھی تب اشک بھر آئے
اور پیشِ نظر پھر گئے حالات ہزاروں
اُن کی جو تمنّا ہے تو پھر بات ہے کیا یہ
پر سب کی خوشی جو ہے وہ منظور ہے مجھکو
شہرت کی منادی سے وہیں سُن لیا سب نے
اور جلوہ نما جوہرِ اخلاص تھے اُن میں
اور شاہ کے شکریے کو باچشمِ تر آئے

اک فرقہ کا احوال نظر طرفہ تر آیا
دولت تھی زر و سیم لُٹاتی ہوئی آگے
شہرت کی دوامی نے کئے نام تھے روشن

وہ سب سے مقدّم تھا قدم مار کر آیا
اور دُور سے تھی نُور اُڑاتی ہوئی آگے
آغاز کی نسبت بہت انجام تھے روشن

اُمیدیں خلائق کی جو تھیں اُنکی طرف تھیں
اور آنکھیں زمانے کی لگیں اُن کی طرف تھیں
تھے اہل جہاں گرد اُمنڈ آئے ہزاروں
اور دامنِ اُمید تھے پھیلائے ہزاروں
تھا ظلم کی ظلمت سے جو ظلمات زمانہ
اور دن سے ہوا آنکھوں میں تھا رات زمانہ
تھے نور بقا شمع جلائے ہوئے آگے
ہاتھوں کے دیئے سب کے تھے آئے ہوئے آگے
پر شکل سے ملبوس سے اور طرزِ سخن سے
تھے مختلف الوضع جو وہ اصل و وطن سے
مَیں اُن میں کسی شخص کو تھا جان نہ سکتا
اور کون ہیں یہ لوگ تھا پہچان نہ سکتا
وہ فرقہ مگر جب مرے نزدیک تر آیا
اور اُن میں مجھے حاتم طائی نظر آیا
سمجھا کہ سخاوت کے یہ پروردہ ہیں سارے
اور چشم مروت کے نظر کردہ ہیں سارے

بعد اُن کے جو اشخاص کہ آتے نظر آئے
وہ شان و شکوہ اور دکھاتے نظر آئے
تھے دولت و اجلال جلو میں لئے آتے
اور سر پہ ہما اُن کے تھے سایہ کئے آتے
تھے چترشہی ہو رہے قربان سروں پر
اور تاج فدا کر رہے تھے جان سروں پر
پر دخل نہ واں تک تھا ذرا تاج زری کا
افسر تھا سرِ فرق دھرا ناموری کا
لہرا رہے ایک ایک کے سر پر جو علم تھے
اعزاز دوامی کے نشاں اُن پہ رقم تھے
تھے اُن پہ جو تاروں کی طرح نام چمکتے
تا حشر رہینگے سحر و شام چمکتے
تھے نور سے تمکین و وقار اُن پہ برستے
اور پھولوں سے تھے رنگ بہار اُن پہ برستے
یکساں تھے بحیثیتِ اقبال وہ سارے
پر وضع میں تھے مختلف الحال وہ سارے
کچھ راز نہاں دل پہ ہوا جس کا عیاں تھا
کسرےٰ لقب اُن میں شہِ نوشیرواں تھا

میں سمجھا کہ ایسے جو بہ تمکین ہیں آتے
اقلیم عدالت کے سلاطین ہیں آتے

مثنوی موسوم بہ گنجِ قناعت

مصروف تھا میں سیر میں شب عالمِ جاں کی
اور زیر نظر راہ تھی اسرارِ نہاں کی

ہر چند تھا جوں نقش قدم خاک کے اُوپر
پر خاک پہ تھا میں گھے افلاک کے اوپر

ہر دم مجھے گھر بیٹھے زمانے کا سفر تھا
اور پاے تصوّر سے ہر اک دل میں گزر تھا

کھولے ہوئے دروازہ ہر اک سینہ تھا آگے
جو سینہ تھا گویا کہ اک آئینہ تھا آگے

سینہ میں کبھی جاں میں کبھی اور کبھی دل میں
اور دل سے پہنچتا تھا کبھی آنکھ کے تل میں

روشن صفتِ آئینہ حالات تھے اُن کے
اور جوہر آئینہ خیالات تھے اُن کے

ہر منعم و ہر مفلس و ہر شاہ کو دیکھا
ہر میکش و صوفیٔ دل آگاہ کو دیکھا

ہر چند کہ رفتار بہ سیر سفری تھی
آنکھوں پہ مگر عقل کی عینک جو دھری تھی

ہر دل میں نظر آتے تھے ارماں ہزاروں
اور ان میں خیالات پریشان ہزاروں

القصّہ ہر اک خانہ و کاشانہ میں ہو کر
یعنی کہ ہر اک دل کے نہانخانہ میں ہو کر

جب پاے نظر میں نے رکھا پیشتر اپنا
اک ایسے دلِ پاک میں پایا گزر اپنا

ہر چند کہ تھا تنگ وہ اوضاع جہاں سے
وسعت میں تھا کم دیدۂ کوتہ نظراں سے

پر گوشہ میں بیٹھا تھا لئے کون و مکاں کو
اور آنکھوں میں طے کرتا تھا میدانِ جہاں کو

دیکھا کہ ہے آراستہ اک انجمن اُس جا
اور جلوۂ انوار ہیں پرتو فگن اُس جا

ہر چند کہ دربار نوشاہانہ نہیں تھا
اُس دور میں جمشید کا پیمانہ نہیں تھا

پر تھا عجب اک نور کا جلوہ کہ نہ پوچھو
اور اُس کا دلوں پر وہ اثر تھا کہ نہ پوچھو

وہ گھر کہ جو سرمایۂ آسودہ دلی تھا
اور کعبۂ دل خلق میں گر تھا تو وہی تھا
واں ڈر کی جگہ دل میں ادب ہوتے تھے پیدا
جو رعب کے ثمرے تھے وہ سب ہوتے تھے پیدا

اک مرد مقدس جو وہاں صدر نشیں تھا
اور کعبۂ عظمت کے مکاں کا وہ مکیں تھا
عالم میں زن و مرد سے لے پیر و جواں تک
آئے کہ نہ آئے کوئی اُس بزم میں واں تک
تھا صدق سے ہر شخص کے دل میں ادب اُس کا
اور خلق میں تھا خواجہ قناعت لقب اُس کا

حاضر تھی جو خدمت میں جماعت ندما کی
ہوتی نہ ریاضت کبھی پہلو سے جدا تھی
اخلاق تھے یاران قدیمی میں ہمیشہ
اور صبر و توکّل تھے ندیمی میں ہمیشہ
ہر چند کہ اک گوشہ میں سجّادہ گزیں تھا
پر مسند عزّت کے لئے صدر نشیں تھا

تھا تاج زری سر پہ نہ سرمایۂ شوکت
اور زیر قدم تخت نہ تھا پایۂ شوکت
پر کہتی تھی دولت کہ یہ ہمّت کا دھنی ہے
صورت یہی کہتی تھی کہ معنوں کا غنی ہے
تھی اُس کے سراپا سے عیاں شانِ قناعت
اور پاؤں لپیٹے تھا بدامانِ قناعت

تھا بسکہ زمانہ سے سروکار نہ اُس کو
دُنیا کی ہوس تھی کوئی زنہار نہ اُس کو
نیت تھی نہ جانی کبھی مضمون طلب تک
اور تھی نہ ہوس دل میں جو آتی کبھی لب تک
تھی چشم تمنّا نہ کسی چیز پہ اُس کی
آنکھوں سے اُبھرتی تھی نہ باہر نظر اُس کی

وہ شمع صفت گرچہ سرِ بزم تھا بیٹھا
اور عزم ہدایت پہ بصد جزم تھا بیٹھا
پر دل جو بھرا تھا ہوس ملک فنا سے
اور رُخ تھا بچائے ہوئے دُنیا کی ہوا سے
نور اُس کا تو آفاق جہاں گھیرے ہوئے تھا
جس رُخ سے مگر دیکھئے منہ پھیرے ہوئے تھا

جو لوگ وہاں اہل طریقت سے تھے آتے
ملتی تھی جنہیں کچھ خبر اس راز نہاں سے
جو دل کے لئے مایۂ روشن گہری تھی
سب اہل یقین دل کی عقیدت سے تھے آتے
اک عینک اُنہیں ایسی عطا ہوتی تھی واں سے
اور بہر نگہ سرمۂ عالی نظری تھی

جوہر یہ کرامات کے تھے اس کے اثر میں
یا دُور کے مقصد کو بھی نزدیک لے آتی
موجود کبھی ہوتے تھے مقصود نظر میں
کر دیتی تھی ہر چیز کو ناچیز نظر میں
اور سامنے اس طرح سے تھی ٹھیک لے آتی
یکساں تھے کبھی بود یہ نابود نظر میں

تھا جلوۂ رُخ سامنے اُس مرد خدا کا
قدرت کا تماشا وہ دکھاتا ہوا آیا
قاصد کی طرح آن کے قالب میں صبا کے
جو وقفۃً اک آگیا جھوکا سا ہوا کا
اک پرچۂ اخبار اُڑتا ہوا آیا
رکھا بہ ادب سامنے اُس مرد خدا کے

وہ نامہ دیا پیک صبا نے جو ہیں لا کر
طوفان طمع میں جو پڑی خلق خدا تھی
تھے اُس میں بہ تفصیل وہ احوال سراسر
دیکھا اُسے تب خواجہ قناعت نے اُٹھا کر
اور چلتی زمانے میں ہوس کی جو ہوا تھی
اور تھے رقم ایک ایک کے اعمال سراسر

اُس نامہ پہ جب خواجہ قناعت نے نظر کی
آزردہ ہوا درد و محبت کے سبب سے
اس طرح سے گرجا کہ ہو جوں ابر گرجتا
معلوم ہوا تھا جو کچھ اخبار میں اُس کو
پر لوگوں کی نیت تھی جو دیکھی ہوئی اُس نے
تحریر کئے اُس میں جو تھے حال یہاں کے
لکھا کہ ہے عالم میں عمل بوالہوسی کا
اور دیکھی یہ روداد بنی نوع بشر کی
منہ پھیر اسوے دست چپ اک بار غضب سے
یا شیر کہ ہو درد سے بے صبر گرجتا
بھیجا ملک القدس کے دربار میں اُس کو
اس واسطے ایک آپ بھی عرضی لکھی اُس نے
اور جن میں تھے آلودہ بد اعمال یہاں کے
یمان ٹھکانے نہیں دُنیا میں کسی کا

دیتے مری نیکی کا بدی ہیں صلہ مجھ کو
ہے ان کو ہوس طوق بگردن کئے پھرتی
آنکھوں پہ لیا سر پہ جو آیا کوئی ٹکڑا
ہیں خواری و زاری کے لئے سارے حق اُس سے

اور کہتے ہیں بے ہمت و بے حوصلہ مجھکو
کتّے کی طرح سب کو ہے در در لئے پھرتی
پر صبر و قناعت کا نہ پایا کوئی ٹکڑا
اے کاش قناعت کا بھی لیتے سبق اُس سے

ایسے بھی ہیں اکثر کہ ہیں افلاس سے مرتے
محنت سے جو برگشتہ ہے نیت ہوئی اُن کی
ہیں خانۂ ہستی میں وہ مکڑی کا نمونہ
تنتے ہیں خیالوں کے سدا تار گھروں میں
جب دیکھو اپاہج کی طرح خوار ہیں گویا

دن رات پڑے ہیں الم و یاس سے مرتے
اور حد سے ہے گزری ہوئی بے ہمتی اُنکی
تن ہو گئے ہیں سوکھ کے لکڑی کا نمونہ
دن رات پڑے رہتے ہیں بیکار گھروں میں
جیتے ہوئے ایسے ہیں کہ مردار ہیں گویا

اور ایسے بھی کچھ ننگ خلائق ہیں جہاں میں
پر دل میں سدا کام سے ہیں جان چراتے
ہیں رنگ فقیری کا جمائے ہوئے بیٹھے
وہ تارکِ دُنیا نہیں عقبےٰ کی غرض سے
ظاہر میں فقط زہد کی تصویر ہیں گویا
ہے چاٹ زباں کو جو لگی مفت خوری کی
جو کچھ ہو نہ کرنا یہ بد انجام ہیں کرتے

جو تن کو لئے بیٹھے ہیں راحت کی اماں میں
اور جان کے پردہ میں ہیں ایمان چراتے
اور دام دغا اُس میں لگائے ہوئے بیٹھے
دُنیا کو ہیں چھوڑے ہوئے دُنیا کی غرض سے
دل دیکھو تو شیطان کے بھی پیر ہیں گویا
پروا ہے اب ان کو نہ بھلی کی نہ بُری کی
اور نام مرا مفت میں بدنام ہیں کرتے

حالات جہاں سارے کئے جب رقم اُس نے
یعنی یہاں رہنا مجھے منظور نہیں ہے
بُلوائیں تو بندہ ابھی اک آن میں آئے
یہ حال ہیں اپنے ہوں گرفتار ہمیشہ

تب کی یہ رقم مہر زبانِ قلم اُس نے
اور آپ کا دربار بھی کچھ دُور نہیں ہے
واں آؤں تو پھر جان مری جان میں آئے
خواری میں جو خوش ہیں تو رہیں خوار ہمیشہ

دیکھا ملک القدس نے حالِ اہلِ جہاں کا   اور حال کھلا اُن کے ہر اک رازِ نہاں کا
فرمایا اسی وقت کہ دربار ہو قائم   اور اُس میں اک آئینہ اسرار ہو قائم
مخلوق کہ ہیں خاص سے تا عام جہاں میں   جاری ہوں اسی دم اُنھیں احکام جہاں میں
تا جملہ زن و مرد سے لے پیر و جواں تک   ہیں ہو چُکے آفاق میں اور ہونگے جہاں تک
وہ آ کے حقیقت سرِ دربار دکھائیں   اور یاں اُنہیں آئینہ اسرار دکھائیں
تا جوہرِ اصلی جو ہر اک دل میں نہاں ہو   آئینہ میں وہ صورتِ آئینہ عیاں ہوں

جس دم یہ دیا حکم جہاندارِ جہاں نے   مشہور کیا خلق میں شہرت کی زباں نے
یاں سُنتے ہی کل خاص سے تا عام تھے جتنے   ارواح سے تا عالمِ اجسام تھے جتنے
جو جو کہ تھی مخلوقِ خدا نیک سے بد تک   اور ہو چُکے یا ہونگے ازل تا بہ ابد تک
تحفے لئے ہاتھوں میں دل و جان کے حاضر   دربارِ مقدس میں ہوئے آن کے حاضر

بیٹھا ملک القدس باورنگِ عدالت   چھایا ہوا آفاق میں تھا رنگِ عدالت
آئینہ کہ جوں شیشۂ افلاک تھا روشن   یا اہلِ صفا کا وہ دلِ پاک تھا روشن
پرتو فگن اُس میں تھے جو انوارِ حقیقت   کُھلتے تھے پڑے خلق کے اسرارِ حقیقت

دربار میں یکبار منادی نے ندا دی   اور گوشِ عقیدت میں وہ ہیں سب کو سُنا دی
یعنی کہ بترتیب ہر اک فرقہ جُدا ہو   اور سامنے آئینہ کے حاضر بصفا ہو
دُنیا میں کسوٹی ہے وہ ہر کھوٹے کھرے کی   اور دنیا خبر ہے نہ دل سے بھی پرے کی
جس شخص کی تصویر کہ اس میں اُتر آئے   باطن کی جو حالت ہے وہ ظاہر نظر آئے

اک فرقہ یکایک ہوا دربار میں حاضر   اور پہلے ہوا معرضِ اظہار میں حاضر
خوشحال بھی تھے اور زدہ احوال بھی اُن میں   تھے حادثۂ دہر کے پامال بھی اُن میں

پر چتر لگائے تھا وقار اُن کے سروں پر
دولت کھڑی ہوتی تھی نثار اُن کے سروں پر
بھوکے بھی جو تھے ان میں تو جی سیر تھے اُنکے
آہو شکمی نے کئے دل شیر تھے اُن کے
خالی تھی سبب سے نہ یہ آہو شکمی بھی
اک بات میں تھی اُن کو قناعت کی کمی بھی
یعنی کہ بظاہر تھے شکم وصل کمر میں
جس سے کہ سبک تھے کس و ناکس کی نظر میں
بھوکے تھے مگر فضل و کمالات کے سارے
محتاج اگر تھے تو اسی بات کے سارے

دیکھے ملک القدس نے جب حال سبھوں کے
آئینہ ہوئے جوہر اعمال سبھوں کے
اعزاز دوامی کے دئے تاج بھی اُن کو
اور ملک قناعت کے دئے باج بھی اُن کو
تا اہل جہاں میں رہیں ممتاز ہمیشہ
اور رہویں زمانہ میں باعزاز ہمیشہ

بعد اس کے گروہ اور اک آتا نظر آیا
اور اُس میں تماشا یہ نظر طرفہ تر آیا
آئے ہوس سب سے قدم مار کے آگے
پر پہنچے جب آئینۂ اسرار کے آگے
سر تا بقدم عکس ہوئے جلوہ گر اُس میں
اس طرح کے آئے وہ نظر جانور اُس میں
جن کے بدنوں پر نہ دہن تھے نہ گلے تھے
کھانے کے لئے سارے شکم ہو کے ڈھلے تھے
ملتی تھی نہ وہ شے کہ قناعت کریں جس پر
مانند مگس تھے کبھی اُس پر کبھی اِس پر
تھے خواری و رسوائی میں دن کاٹتے پھرتے
اور ہونٹ تھے مکھی کی طرح چاٹتے پھرتے
پر ولولہ حرص نہ ہوتے تھے کم اُن کے
غربال کی صورت تھے نہ بھرتے شکم اُن کے

کچھ لوگ عجب رنگ دکھلاتے ہوئے آئے
اور اپنے تماشے پہ ہنساتے ہوئے آئے
راحت طلبی اُن کو گرانبار تھی کرتی
اور زندگی اس طرح سے مردار تھی کرتی
ہل کر انہیں جانا تھا کہیں گور کا جانا
یا قید مشقت کی طرف چور کا جانا
آنے میں بھی تھے جان چُرائے ہوئے آتے
لوگ ان کو تھے کاندھوں پہ اُٹھائے ہوئے آتے
القصہ وہ جب بیچ میں دربار کے آئے
اور سامنے آئینۂ اسرار کے آئے

تھے سانڈ کہ سر ڈال کے ناچار کھڑے تھے
اور کرتے تھے جگالی سرِ دربار کھڑے تھے

اور ٹٹی کی اوجھل میں جو عیار تھے بیٹھے
دن رات شکاروں کے طلبگار تھے بیٹھے
پردہ میں قناعت کے وہ تھے تیر لگاتے
اور دام دغا تھے پئے نخچیر لگاتے
ظاہر میں بڑی تمکنت وشان سے آئے
لیکن نظر آئینہ میں شیطان سے آئے
روباہ کی صورت نظر آتے تھے وہ سارے
گرگٹ کے مگر رنگ دکھاتے تھے وہ سارے

جس خانۂ دل میں یہ طلسمات عیاں تھے
آئینۂ حالات وخیالات جہاں تھے
اس طرح کا گھر خلق میں سوچو تو کہاں ہو
حیراں ہوں کہ وہ خانۂ دل ہو تو کہاں ہو

بند آنکھیں کئے کیوں پھرے ایک ایک کے گھر تو
اپنے ہی چپ و راست ذرا غور تو کر تو
پہلو میں کہیں تیرے نہ وہ خانۂ دل ہو
آزاد وہ اپنا ہی نہ کاشانۂ دل ہو

مثنوی مسمّٰے بہ ابرِ کرم

جو نکتہ یاب ہیں کتبِ انقلاب کے
دن رات کو سمجھتے ورق ہیں کتاب کے
دفتر ہے اُن کے سامنے ماضی و حال کا
جو آگے آئینہ ہے دکھاتا مثال کا
شاہانِ ماسلف کے مرقع عجیب ہیں
روشن سب اُس میں عہد بعید و قریب ہیں
تحریر تازہ لاتی ہے تقدیر سامنے
آتی ہے دمبدم نئی تصویر سامنے
اس کشورِ فنا کا عجب طرز و طور ہے
دم بھر میں صورت اَور ہے دم بھر میں اَور ہے
قانون انقلاب یہاں رسم و راہ ہے
موسم بہ موسم اس میں نیا بادشاہ ہے
اب یاں جو چند روز سے قانون عام ہے
گرمی کے بادشاہ کا گرم انتظام ہے

عالم تھا شعلہ خیز و فلک شعلہ ریز تھا | اک حکم تھا جو گرم تو اک حکم تیز تھا
مُنہ پر زمیں کے دیکھو تو ہے خاک اُڑ رہی | اور گرد چار سُو تہِ افلاک اُڑ رہی
دُنیا میں بوند بوند کو خلقت ترس رہی | پانی کی جائے آگ فلک سے برس رہی
شہروں میں سوکھ سوکھ کے جنگل چمن ہوئے | اور جنگلوں میں دھوپ سے کالے ہرن ہوئے
طفلِ بنات پیاس کے مارے بلک گئے | خلقِ خدا کے نالے بہت دور تک گئے
سیماب ہو کے سینہ سے ہر دل نکل چلا | اور آفتاب شمع کی صورت پگل چلا
دِل تشنگی کے مارے یہ بیتاب ہو گئے | اِنساں تڑپ کے ماہیِ بے آب ہو گئے
پر اب ہے دَور دَورِ شہِ برشکال کا | چھایا فلک پہ ابر ہے جاہ و جلال کا
گرمی کا جو بخار تھا سارا نکل گیا | اور رنگ آسمان و زمیں کا بدل گیا
فرمانِ راحتِ سحر و شام آ گیا | خلقِ خدا کی جان کو آرام آ گیا

اے ابر آ کہ تُو تو شہِ برشکال ہے | جو خشک و تر ہے تیرے کرم سے نہال ہے
تیرے عمل کے واسطے رنگِ جہاں ہے اَور | تیری زمیں ہے اَور ترا آسماں ہے اَور
نوروز آب و رنگ بہارِ جہان ہے | تو نو بہارِ کشورِ ہندوستان ہے

اے ابر جوش سبزہ و گلبن نہیں ہے یہ | پھُولوں نہیں سماتی خوشی سے زمیں ہے یہ
مُدت سے انتظار تھا تیرا جہان کو | آنکھیں سبھوں کی لگ گئی تھیں آسمان کو
آنے سے تیرے آگیا آنکھوں میں نور ہے | دیوار و در سے آج برستا سرور ہے
تیرے ہی دم قدم کی یہ سب لہر بہر ہے | سیراب کوہ و دشت تو شاداب شہر ہے

ہر قطرہ تیرا قطرہ ہے آبِ حیات کا | پاتا حیات تجھ سے ہے عالم نبات کا
تو دودھ ہے نبات کے اطفال کے لئے | اور زندگی درختِ کہن سال کے لئے
اے ابر زور کیا کہوں ہیں تیرے شیر کے | دانہ پہاڑ کو ہے نکل آتا چیر کے

سب تجھ سے نونہال چمن سبز بخت ہیں
اور میووں سے بھرے ہوئے دامن درخت ہیں
یہ پھول پھل نہیں ہیں برابر نکل پڑے
ہیں جو صلے بہار کے باہر نکل پڑے

گہ پرنیان سبز اُڑھاتا زمیں کو ہے
پھولوں سے گاہ کرتا شگفتہ جبیں کو ہے
گردوں پہ کرتا عالم نیرنگ ہے کبھی
دکھلاتا ایک رنگ میں سو رنگ ہے کبھی
سیماب صبح میں کبھی شنگرف گھولنا
اور وہ نگارخانہ چینی کا کھولنا
لاتا کبھی کچھ اور ہی جوش و خروش ہے
کرتا فلک کو بادلوں سے دگلہ پوش ہے
یوں رنگ دمبدم جو بدلتا جہاں کے ہے
اے ابر سیکھی شعبدہ بازی کہاں سے ہے

اے ابر جب تو آتا ہے میداں پہ اوج کے
دَل بادَل آگے پیچھے لئے ساتھ فوج کے
آتا ہے دیوزاد کی صورت بنا کے تو
اور بال و پر نمد کے ہے اُڑتا لگا کے تو
اُس وقت تیرے رعد کی آواز ہے غضب
اے ابر تیرے ساتھ یہ دمساز ہے غضب
بل بے تری گرج کہ دلِ زار ہل گئے
ہیبت سے رعد و برق کی کہسار ہل گئے
لیکن جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں ہیں آرہیں
اور ٹہنیوں کے سازوں پہ سُر ہیں ملا رہیں
کوئل کی کوک اور پپیہے کا بولنا
اور میٹھی بولیوں میں وہ شربت کا گھولنا
اے ابر سب یہ ساز و نوا تیرے دم سے ہیں
یہ لطف عیش و لطف ہوا تیرے دم سے ہیں

غنچوں کے مارے پیاس کے تھے مُنہ کھلے ہوئے
گلشن کے نونہالوں کے منکے ڈھلے ہوئے
انسان پھرتے پیاس سے تھے بدحواس سے
منہ کھولے تھے کبوتر و گنجشک پیاس سے
رونق سبھوں کے مُنہ پہ ہے اِس آن آگئی
آنے سے تیرے جان میں ہے جان آگئی

تیرا خطاب رحمتِ پروردگار ہے
خلق خدا کے رزق کا تو ذمّہ دار ہے
سرمایہ تو ہی دیتا ہے تجّار کے لئے
اور سایۂ ہُما ہے زمیندار کے لئے

اے ابر وہ جو خلق میں دہقان پیر ہیں
عمریں ہوئیں لکیر پہ بیٹھے فقیر ہیں
اُن کو اُمید تھی ۔ نہ کسی کی پناہ تھی
تجھ پہ نظر تھی یا کہ خدا پر نگاہ تھی
آج اپنے رنج و فکر سے اُن کو فراغ ہیں
ہیں بیٹھے اپنے کھیتوں پہ اور باغ باغ ہیں

اے ابر تیرے فیض کا ہر جا وفور ہے
پر کوہ و کوہسار میں کچھ اور نور ہے
ہیں سب پہاڑ پھولوں سے دامن بھرے کھڑے
اور گلبنوں سے لے کے شجر تک ہرے کھڑے
چشمے ہیں جابجا تری رحمت کے بہہ رہے
گویا زبان موج سے ہیں وصف کہہ رہے

ریتی پہ خشک لب تھا جو دریا پڑا ہوا
ہو جیسے کوئی سانپ سسکتا پڑا ہوا
اب پوچھتا فلک سے ہے مقدار اوج کی
دیکھو میں آیا توڑ کے زنجیر میں موج کی
دیوانہ وار کف بہ لب آب مارتا
گاہے تھپیڑ ہے گہے گرداب مارتا
یہ جوش یہ خروش سما ہے دکھا رہا
ہر موج میں ہے نوح کا طوفاں اُٹھا رہا

پر مجھ کو رشک ہے اُسی مستِ مدام پر
جس کی کہ مےکشی نہیں موقوف جام پر
مستانہ پن میں رکھتا ہے دیوانہ طور بھی
مستانے ساتھ رکھتا ہے دوچار اور بھی
سبزہ پہ لوٹتا ہے دماغ آسماں پہ ہے
اور دمبدم یہ مطلع موزوں زباں پہ ہے
یوں پھوٹ کر جو ہیں گل و ریحان نکل پڑے
کیا جانے کن دلوں سے ہیں ارمان نکل پڑے

اس وقت تو جو چھایا ہوا ہے جہان پر
چھایا ہوا سما ہے زمیں آسمان پر
چلنا وہ بادلوں کا زمیں چوم چوم کر
اور اُٹھنا آسماں کی طرف جھوم جھوم کر
بجلی کو دیکھو آتی ہے کیا کوندتی ہوئی
سبزہ کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روندتی ہوئی
آتی ادھر صبا ہے اُدھر سے نسیم بھی
اور اُن کے ساتھ ساتھ ہے آتی شمیم بھی
مستی میں جھومنا وہ جوانانِ باغ کا
جھک جھک کے لینا ہاتھ سے گل کے ایاغ کا

سبزہ کے عکس سے در و دیوار سبز سبز
سیراب باغ و دشت تو کہسار سبز سبز

ان سبز سبز کیاریوں پر دل ہیں لوٹتے
طوطی بزنگ طائرِ بسمل ہیں لوٹتے

شبنم عجب بہار ہے اپنی دکھا رہی
موتی بکھیرتی ہے جواہر لُٹا رہی

سبزہ کے برگ برگ ہیں موتی جڑے ہوئے
شاخ و شجر تمام مرصّع کھڑے ہوئے

پتّوں پہ آب و رنگ سے مینا نگار ہیں
ٹپکے اگر ہوا سے تو ہیرے کا ہار ہیں

شبنم کا جوش اگر یہی طوفاں اُٹھائیگا
ہیرا چمن کی اوس پہ الماس کھائیگا

تو بادل اب گرجتے ہوئے سر پہ آگئے
اور شامیانے شرق سے تاغرب چھاگئے

کیا مست آیا جھوم کے سرشار ابر ہے
برسیگا آج خوب دھواں دھار ابر ہے

آیا اُمنڈ گھمنڈ کے عجب دھوندوکار ہے
تو دن کی گر لگا وے جھڑی تو بہار ہے

لیکن یہ باجرا سا برسنا پھوار کا
ہیگا پیام ابر بہاری کے تار کا

بوندوں میں جھومتی وہ درختوں کی ڈالیاں
اور سبز کیاریوں میں وہ پھولوں کی لالیاں

وہ ٹہنیوں میں پانی کے قطرے ڈھلک رہے
وہ کیاریاں بھری ہوئیں تھالے چھلک رہے

آبِ رواں کا نالیوں میں لہر مارنا
اور روے سبزہ زار کا دھو کر سنوارنا

گرنا وہ آبشار کی چادر کا زور سے
اور گونجنا وہ باغ کا پانی کے شور سے

جل تھل ہیں کوہ و دشت میں تالاب و آب کے
گویا چھلک رہے ہیں کٹورے گلاب کے

ہر جا پہ طائرانِ چمن غول غول ہیں
آپس میں بول بول کے کرتے کلول ہیں

کوئل کا دُور دور درختوں میں بولنا
اور دل میں اہل درد کے نشتر گھنگولنا

طاؤس کا وہ دُم کو چنور کر کے ناچنا
اور مورنی کا اشک کے موتی کو جا چُگنا

لیکن چمن سے ناچ کے چلتا جو مور ہے
اک قہقہہ بہ طنز لگاتا چکور ہے

املی کے اک درخت میں جھولا پڑا ہوا
اور ساتھ اُس کے آم کا ٹپکا لگا ہوا

جھولوں میں نوجوان ہیں پینگیں چڑھا رہے
اور بچّے آم کے ہیں پپیہے بجا رہے

ساون کے گیت اُٹھا رہے طوفان دلوں میں ہیں
پردیسیوں کی یادوں سے ارمان دلوں میں ہیں

ہر تان ہیں ملھار کی مستی کا شور ہے
بادل گرج کے پردے میں دیتا ٹکور ہے

اے ابر تیری رات کی تعریف اگر کروں
لازم ہے پہلے میں رہِ ظلمات سر کروں
کیا کیا بیاں کروں میں تری رات کا مزا
گر رات کا مزا ہے تو برسات کا مزا
سنسان رات اور وہ آئی ہوئی گھٹا
چاروں طرف جہان میں چھائی ہوئی گھٹا
بجلی کبھی کبھی نگہِ فتنہ ساز سے
کرتی نقاب ابر میں چشمک ہے ناز سے
اور کوکنا پپیہے کا وہ دل کی ہوک سے
نالہ کو اپنے تولنا کوئل کی کوک سے
کوٹھے پہ ٹھنڈے ٹھنڈے بچھونے وہ اوس میں
ہے گل کو فخر آوے اگر پائے بوس میں
آنا وہ بھیگی بھیگی ہوا کا کبھی کبھی
بول اٹھنا مرغ نغمہ سرا کا کبھی کبھی
آرام کہہ رہا ہے کہ میرے ہی ہو رہو
قسمیں ہے دینی نیند کہ بس اب تو سو رہو
آزاد لکھتے لکھتے ہے آدھی تو ڈھل گئی
اور شمع لالٹین میں ساری پگل گئی

طولِ امل کو اپنے اب انجام دیجئے
کوئی گھڑی تو آپ بھی آرام کیجئے

مثنوی زمستاں

آ زمستاں کہ ہے تو بادشہِ برفانی
شاہ برفانی و شاہنشہِ برفستانی
تختِ اقبال ہے عالم سے نرالا تیرا
اور ہے دربارِ سرِ کوہِ ہمالا تیرا
شرق تا غرب ترا ملک ہے ہر طرف سفید
اڑ رہا پرچمِ اقبال ہے جوں برف سفید
جبکہ عالم پہ ہے تو لشکرِ جنگی لاتا
کوہ و صحرا کو برابر ہے الٹتا آتا
بادِ صرصر ہے نشاں تیرا اڑاتی آتی
فوجِ اقبال کو رستہ ہے بتاتی آتی
طرفۃ العین میں کر لیتا ہے تسخیرِ جہاں
تیرے آتے ہی بدل جاتی ہے تاثیرِ جہاں

جس طرف تیرے پھریرے کا ہے جھونکا جاتا — مارے ہیبت کے ہے دل سینوں میں تھرّا جاتا

ہے نباتات کا عالم نہ و بالا تجھ سے — پُرزے پُرزے ہے گلستاں کا رسالہ تجھ سے

باغ پر جب ہے ترے قہر کا جھونکا آتا — ڈر کے ہر برگ ہے پیوند زمیں ہو جاتا

تیرے سنّاٹے سے ہوتی ہے ہوا جانِ نبات — خوف کے مارے دہل جاتے ہیں طفلانِ نبات

تھرتھراتے ہیں کھڑے سارے جوانانِ چمن — مُنہ چھپاتے ہیں گل و سنبل و ریحانِ چمن

ہیں شجر سر پہ کھڑے خاک اُڑاتے سارے — گل و گلزار ہیں ویراں نظر آتے سارے

نغمہ سنجانِ چمن پر ہیں پُھلائے بیٹھے — اور پر و بال ہیں ہیں مُنہ کو چھپائے بیٹھے

باغباں کا جو گلستاں میں گزر ہوتا ہے — لب حیرت سے یہی کہتا ہے اور روتا ہے

یا الٰہی وہ جوانانِ چمن ہو گئے کیا — باغ سنسان ہے مرغانِ چمن ہو گئے کیا

رازِ غم کس سے کُھلے باغ میں بلبل بھی نہیں — کان میں پوچھئے کس سے کہ رہا گل بھی نہیں

نہ تو غنچہ کوئی باقی ہے کہ جو مُنہ کھولے — نہ ہے گلزار میں سوسن جو زباں سے بولے

کہ درختانِ چمن باغ میں عریاں کیوں ہیں — ہاتھ پھیلائے کھڑے ششدر و حیراں کیوں ہیں

اے زمستاں جو ہوئی خامہ سے ہے بو العجبی — فی الحقیقت ہوئی خدمت میں تری بے ادبی

تجھ سے ہے دور ہواؤں کی کثافت ہوتی — دفع زہرِ حشراتی کی ہے آفت ہوتی

خلق سے دفع وباؤں کی بلا ہوتی ہے — اور مریضوں کو ترے دم سے شفا ہوتی ہے

خشک ہوتی ہے مزاجوں کی رطوبت تجھ سے — پاتا ہر میوۂ شیریں ہے عذوبت تجھ سے

تو نے ہے صاف جہاں قاف سے تا قاف کیا — شیشۂ گنبدِ فیروزہ ہے شفّاف کیا

مخمل و قاقم و سنجاب پہناتا تو ہے — بہت اثمار تر و خشک کھلاتا تو ہے

تو نہ تھا جب تو نہ تھا جان کو جینے کا مزا — تھا نہ کھانے ہی کا کچھ اور نہ پینے کا مزا

اب عمل میں ترے آرام سے سب جیتے ہیں — گرم کھاتے ہیں غذا آبِ خنک پیتے ہیں

یا تو گرمی سے نہ تھا پاس بھی بیٹھا جاتا — اور بغل سے دلِ وحشت زدہ نکلا جاتا

یا ہیں اب ہاتھوں کو بغلوں میں دبائے بیٹھے — آگ ہاتھ آئے تو ہیں دل میں چھپائے لیتے

مارے سردی کے جگر سینوں میں تھراتے ہیں
ہے کوئی چھینٹ کا اوڑھے ہوئے فرغل بیٹھا
اوڑھ بیٹھا کوئی سردی سے لحاف اپنا ہے
کچھ لحافوں سے ابھی مُنہ کو نکالے ہیں پڑے
کئی سکڑے ہوئے بیٹھے ہیں کئی کانپتے ہیں
کہیں سُوسُو کہیں سی سی ہے کہیں سیٹھی ہے
حال دیکھے ہیں جو یہ خلق کی بدحالی کے
اس کی ہر بیل میں چھپ چھپ کے ہیں سنبل بیٹھے
خلق سے گرمی و سردی کی جو ہے لاگ لگی
ہر نفس بھاپ کے پردے میں نکلتے ہیں دھوئیں

بچے ماں باپ کی بغلوں میں گھسے جاتے ہیں
پر پھلائے ہوئے جیسے کوئی بلبل بیٹھا
کوئی کر بیٹھا بچھونے کو غلاف اپنا ہے
لیکن انگیٹھی کو پہلو میں سنبھالے ہیں پڑے
ہیں کئی کانپتے سردی سے کئی ہانپتے ہیں
گرد سب بیٹھے ہیں اور بیچ میں انگیٹھی ہے
رونگٹے ہوگئے سردی سے کھڑے قالی کے
پردۂ رنگ میں ہیں دبکے ہوئے گل بیٹھے
تن تو ٹھنڈے ہیں پڑے سینوں میں ہے آگ لگی
دل میں ہے آگ لگی مُنہ سے اُگلتے ہیں دھوئیں

تیرے افضال سخاوت تہِ افلاک ہیں عام
اہلِ دولت کو ہیں خلعت میں دوشالے ہوتے
کر دیا تو نے ہے خلقت کو ہر اک حال میں مست
بتانِ عالم ہیں الگ بستر مخمل میں پڑے

بلکہ سب اہلِ جہاں کے لئے پوشاک ہے عام
غربا سارے ہیں کمل کے حوالے ہوتے
ہے کوئی کھال میں مست اور کوئی شال میں مست
فقرا لیٹے ہیں سب ایک ہی کمل میں پڑے

اے زمستاں کہوں کس طرح تری رات کا لطف
کی تری رات نے داناؤں کی ہے بات بڑی
ہے جواں لیتا اسی شب میں جوانی کا مزا
بزمِ احباب کی صحبت کا مزا ہے تجھ سے
شب سرما ہی میں ہے گانے بجانے کا مزا
یار حقے کے ترے دور میں لیتے ہیں مزے
گھونٹ حقے کا یہ ہر دم نہیں ہم بھرتے ہیں

تیری شبہائے دراز اور وہ ہر بات کا لطف
کہ کبھی دن ہیں بڑے اور کبھی رات بڑی
اور جو بڈھا ہے تو لیتا ہے کہانی کا مزا
ساز عشرت کے لئے برگ و نوا ہے تجھ سے
پان کھانے کا گلوری کے چبانے کا مزا
دور تلخ اُسکے سوا دود سے دیتے ہیں مزے
اے زمستاں یہ ترے عشق کے دم بھرتے ہیں

صوفی و رند کے جلسے کا تو ہی ساقی ہے
مایۂ عیش و طرب دم سے ترے باقی ہے

ہر طرف ہیگی پپالی پہ پیالی اُڑتی
مے نہ ہووے تو ہے تصویر خیالی اُڑتی

بے نشے مست پڑے شکر خدا کرتے ہیں
چائیں پی پی کے ترے سر کو دُعا کرتے ہیں

شبِ سرما ہیں اگر لطف ہے مینوشی کا
تو اِسی شب ہے مزا مجلسِ خاموشی کا

ہیں کبھی عالمِ ارواح کے مہماں آتے
بزم دربار میں ہیں صاحبِ فرماں آتے

دِل کے ایواں ہیں ہیں وہ آکے عدالت کرتے
ہیں گناہوں کے وکیل اُن کی وکالت کرتے

جلوہ گر پیش نظر ہوتی ہے فانوسِ خیال
پھرتے ہیں چار طرف دوڑتے جاسوس خیال

بیٹھا جمشید کہیں دیکھتا ہے جام اپنا
پر سمجھ میں نہیں آتا ہے کچھ انجام اپنا

دوش ضحاک پہ آتے ہیں کبھی مار نظر
سرِ ضحاک ہے آتا بہ سرِ دار نظر

گرز کو دوش پہ رستم ہے اُٹھائے جاتا
ہفتخواں میں ہے کبھی رخش اُڑائے جاتا

کبھی سہراب سر خاک نظر آتا ہے
باپ بھی غم سے جگر چاک نظر آتا ہے

کہیں دربارِ سکندر کہیں بزمِ دارا
اور کہیں عزم سکندر ہے بہ رزم دارا

تن دارا ہے کبھی بے سر و افسر ہوتا
اور سرہانے ہے کھڑا اُس کے سکندر روتا

خضر کے ساتھ سکندر کبھی ظلمات میں ہے
کبھی نوشابہ سے مصروف ملاقات میں ہے

زند پازند کو زرتشت سُناتا ہے کبھی
شعلہ درآب ہیں آتش کو دکھاتا ہے کبھی

کبھی محمود ہے چڑھکر سرجے پال آتا
کشورِ ہند ہیں گویا کہ ہے بھونچال آتا

نقشہ نعمان خورنق کا جماتا ہے کبھی
سنّمار اپنے کٹے ہاتھ دکھاتا ہے کبھی

گاہ چنگیز ہے اور گاہ ہلاکو آتا
جیسے گھر لوٹتا ہووے کوئی ڈاکو آتا

جب بہت طول پکڑتی ہے شب دیجوری
لے کے تیمور ہے آتا تزکِ تیموری

ہند سے گرچہ بہت جلد چلا جاتا ہے
پشت در پشت مگر سکّہ جماجاتا ہے

بزمِ افسانہ میں واں خسرو پرویز بھی ہے
باربد زمزمہ سے اپنے شکر ریز بھی ہے

قصرِ شیریں سے ہے فرہاد بھی دلگیر آتا
خونِ فرہاد سے تیشہ ہے کھلاتا لالہ
پر بغل میں لئے شیریں کی ہے تصویر آتا
چادر اوڑھے ہے کھڑی پیر زنِ دلّالہ

ہیں یہاں انجمنِ علم کے جو صاحبِ راز
خانۂ دل میں وہ اک بزم ہیں قائم کرتے
فخرِ رازی کبھی لے آتے ہیں تفسیرِ کبیر
ہوتی ہیئت کی مجسطی سے ہے توضیح وہاں
ہے کوئی جلد دلائل کو مجرّے کرتا
ہے دلائل سے خلا کو کوئی باطل کرتا
دفعۃً چلتی ہے مجلس پہ ہوائے یوناں
ہے فلاطوں لئے اشراق کے آئینہ کو
پر ارسطو جو کبھی بزم میں آجاتا ہے
فصلِ سرما میں ہیں جب دیکھتے شبہائے دراز
منعقد مجلسِ اربابِ عمائم کرتے
بوعلی آکے سُناتے ہیں شفا کی تقریر
کبھی ہوتی ہے سطرلاب کی تسطیح وہاں
کوئی ابطالِ جزٔ لایتجزّے کرتا
پر ہے دانائے فرنگ اُسکو بھی قائل کرتا
یعنی تشریف ہیں لاتے حکمائے یوناں
کرتا آئینہ سے ہے صاف سوا ئینہ کو
باتوں ہی باتوں میں ہر شکل مٹا جاتا ہے

رکھتے ہیں جو کہ طبیعت میں ہوائے چمنی
آکے سودا کبھی اک ہجو سُنا دیتے ہیں
پھر کبھی بڑھ کے سُناتے ہیں قصیدہ اپنا
ناسخ و آتش و انشا و نصیر آتے ہیں
چلتی ہے اُن کے دِلوں پر جو ہوائے چمنی
لیکن اس طرح کہ محفل کو لُٹا دیتے ہیں
میر پڑھتے ہیں کوئی شعر گزیدہ اپنا
غالب و ذوق مگر خاتمہ کر جاتے ہیں

ہوتی اتنے میں ہے افلاک پہ تنویرِ سحر
سر پہ وہ اپنے بکھیرے ہوئے ہے موئے سفید
شجرِ طور کا عالم ہے بناتا آتا
ہند کو کابل و کشمیر بنا دیتا ہے
ٹیکتا آتا ہے مشرق سے عصا پیرِ سحر
ریش پر نور میں ہے جلوہ نما روئے سفید
ساتھ ہے کوہ ہمالا کو اُٹھاتا لاتا
ملکِ تاتار کی تصویر دکھا دیتا ہے

گرچہ ہر جا پہ ترے چلتے قوانین ہیں اور
ایک جھوکا جو ترے حکم کا آجاتا ہے
زرد ہو جاتے ہیں سب دشت سے کہسار تلک
واں اسی فصل میں گویا نظر آتی ہے بسنت
عقل حیراں ہے کہ سونا یہ بکھیرا کس نے
بعض اشجار پہ ہے حکم بہت سخت آتا
دل میں ہر برگ کے یوں آگ لگا دیتا ہے
ہر شجر پر ہے غرض رنگ بدل کر آتا

اے زمستاں ترے اس ملک میں آئین ہیں اور
تو نباتات کا سب رنگ بدل جاتا ہے
کوہ سے کاہ تلک باغ سے اشجار تلک
زعفراں پوش درختوں کو بناتی ہے بسنت
آب زر روے نباتات پہ پھیرا کس نے
پتے پتے کو جلاتا ہوا یک لخت آتا
جس طرح سے کوئی تانبے کو تپا دیتا ہے
کہیں زرکار ہے آتا کہیں مسکر آتا

پر ترے حکم کے جھونکے ہیں سوا تیزی ہے
برگ دیکھو تو ہیں سب جھڑ کے سرِ خاک پڑے
دفعتاً پیر سحر سانس ہے بھرتا ایسا
کہ جہاں آنکھوں میں ہو جاتا ہے یکبار سفید
ابر کی طرح بخارات کا گھِر کر آنا
ہلکے ہلکے کبھی مکڑی کے ہیں جالے اُڑتے
جا بجا آبِ رواں چلنے سے ہیں تھم جاتے
جو شجر گلشنِ ہستی میں برہنہ تھے کھڑے
شجرِ نورِ سرِ طور نظر آتے ہیں

کہ نباتات پہ طوفان بلا ریزی ہے
اور شجر سب ہیں برہنہ تہِ افلاک کھڑے
یا زمانہ پہ وہ کچھ سحر ہے کرتا ایسا
دشت و کہسار سے لے تا در و دیوار سفید
برف کے پردہ میں وہ روئی دُھنکنے جانا
اور ہوا میں ہیں کبھی روئی کے گالے اُڑتے
اور سرِ چشمہ ہیں شیشے کی طرح جم جاتے
یا کہ پتوں کا بڑھاتے ہوئے گہنا تھے کھڑے
سر بسر غیرتِ بلّور نظر آتے ہیں

ہیں زمستاں ترے سب کام زمانہ سے الگ
جام گردوں میں ہے تو شیر جماتا کیونکر
ابر و باراں تو تہِ چرخِ بریں دیکھا تھا

یہ لطیفہ ہے مگر فہم میں آنے سے الگ
اور ہوا میں ہے تباشیر اُڑاتا کیونکر
پر برستا ہوا کافور نہیں دیکھا تھا

جبکہ ہوتا ہے گزر جانبِ کہسار ترا
بُت تراشی میں ہے تو غیرتِ فرہاد وہاں
اک طلسمات کا عالم ہے دکھاتا جاتا
پتے پتے کا ہے تصویر میں انداز دُرست
اژدہا دامنِ کہسار میں سوتا ہے وہیں
ہے کہیں دیو کی تصویر نمودار کھڑی
چیتا کہتا ہے کہ میں جست ابھی کر جاتا ہوں
برف کا بیل کہیں سر ہے جھکائے بیٹھا
شیر وابستۂ زنجیر بناتا ہے وہیں
کبھی انساں کبھی حیوان بنا دیتا ہے

فنِ صنعت ہے وہاں اور کچھ اے یار ترا
قصرِ شیریں کی ہے تو ڈالتا بُنیاد وہاں
صورتیں برف سے کیا کیا ہے بناتا جاتا
اور ہر اک میوہ ہے قدرت سے خداساز درست
برف کا اسپِ سبک خیز بھی ہوتا ہے وہیں
اور پری ہے پر پرواز سے تیار کھڑی
اور ہرن کہتا ہے میں چوکڑی بھر جاتا ہوں
اور کہیں اونٹ ہے گردن کو اُٹھائے بیٹھا
اور کبھی فیل کی تصویر بناتا ہے وہیں
اور کبھی صورتِ شیطان بنا دیتا ہے

اے زمستاں جو کبھی آذر و فرہاد ہے تو
برف سے جب ہے نکھرتا فلکِ زنگاری
کسی صیاد کو ہے کر کے ضیافت لاتا
لیتا پھر کارِ قلم ہے دمِ شمشیر سے تُو
کی سرِ خاک جو تھی برف نے سیمیں کاری
صیدِ نومید کا خوں رنگ جو دکھلاتا ہے

تو کبھی رشکِ دہِ مانی و بہزاد ہے تُو
اور تری طبع ہے آتی سوئے رنگیں کاری
اور کوئی صید ہے سرگشتۂ آفت لاتا
اور ہے شنگرف کو لیتا رگِ نخچیر سے تو
خونِ بے جرم سے کرتا ہے اسے گلناری
تیر سا دیدۂ عبرت میں چبھا جاتا ہے

ہے گزر جب کہ ترا جانبِ دریا ہوتا
ایسا تو حکمت جادو سے جماتا ہے اُسے
کاروانوں کی برابر ہیں قطاریں جاتیں
پل میں لے کشتی و پُل پار اُتر جاتے ہیں
روئے دریا پہ گزر مثلِ نظر ہوتا ہے

اک طلسمات کا گویا ہے تماشا ہوتا
سر بسر تختۂ الماس بناتا ہے اُسے
جس طرح دشت میں ہرنوں کی ہوں ڈاریں جاتیں
سفری سیکڑوں بے لاگ گزر جاتے ہیں
ایسے جاتے ہیں کہ دامن نہیں تر ہوتا ہے

گلشنِ دانش و فرہنگ جو ہے ملکِ فرنگ
بارہ سنگے کہیں گہیں ہیں اُڑاتے جاتے
نوجواں ہیں کہ جوانی کی شرابوں سے ہیں مست
ہے زبس جوشِ دلی حوصلہ انگیزی میں
پاؤں ہیں کاٹ کے موزوں کو چڑھائے ہیں کھڑے
قدم آگے کو رپٹ کر ہیں نکلتے جاتے
کوئی گھڑ دوڑ میں جیتا کوئی ہارا ہوگا

اے زمستاں ہیں وہاں تیرے عجب عیش کے رنگ
جلوۂ تخت ہوادار دکھاتے جاتے
پہلواں بے مے و بے جام شرابوں سے ہیں مست
سب کمر بستہ ہیں میدان سبک خیزی میں
اور عصا اپنے سر برف جمائے ہیں کھڑے
یہ اُچھل جاتے ہیں اور آگے پھسلتے جاتے
پر رپٹ دوڑ کا میدان نہ مارا ہوگا

بس کر اے دل کہ نہیں لکھنے کی طاقت باقی
دیکھ کاغذ ورق ہاتھ میں تھرّاتا ہے
مارے سردی کے ہے سر اپنا جھکائے لیتا
مرے اللہ تو ہی اب ہے بچانے والا
آرزو کچھ نہیں دُنیا کی رہی ہے دل میں

مارے سردی کے نہیں ہاتھ میں حالت باقی
اور قلم ہاتھ سے تھرّا کے گرا جاتا ہے
مُنہ ہے کاغذ کی رضائی میں چھپائے لیتا
ترے آزاد کو جاڑے سے پڑا ہے پالا
اب تمنا جو ہے باقی تو یہی ہے دل میں

طپشِ عشق سے دل رہوے مرا نرم سدا
گرمیٔ شعر و سخن سینہ رکھے گرم سدا

مثنوی مصدرِ تہذیب

زمیں پہ مہر کی جس دن کہ تھی نظر پہلی
مزاجِ جملہ عناصر کا اعتدال پہ تھا
وہ صبح خلق میں بنیاد تھی زمانہ کی
اُفق میں تھا کوئی کافور اُڑا رہا گویا

اور آفرینشِ عالم کی تھی سحر پہلی
اور اعتدال سے جو کام تھا کمال پہ تھا
اور ابتدا تھی زمانہ کے کارخانہ کی
زمیں سے تا بفلک نور اُڑا رہا گویا

اُٹھی وما نۂ دولت سے دفعتہً یہ صدا
اُٹھو کہ صبح سعادت کی نوبت آئی ہے
اُڑی جہاں میں نہ گُنبدِ کہن یہ صدا
نظر کرو کہ عیاں شان کبریائی ہے

صدا کے ساتھ اُڑے سب کے خواب آنکھوں سے
نظر اُٹھا کے جو دیکھا عیاں ہے شان خدا
جلوس ہے ملک القدس کا بروے سریر
زبسکہ ذات مقدّس ہے اس کی ذات کمال
صفات ذات اراکین دولت اُس کے تھے
دِلوں سے اُٹھ گئے پردے حجاب آنکھوں سے
کُھلا ہے فیض کا در بہر بندگان خدا
نگاہ ذرّہ و خورشید ہے بسوے سریر
کھڑے ہیں دست ادب باندھے سب صفاتِ کمال
بنائے دولت و سامان صولت اُس کے تھے

زبسکہ فیض سحر تھے دِلوں پہ چھائے ہوئے
تھی اعتدال پہ جو واں کی بات ہوتی تھی
شعاع مہر زیادہ چمک نہ سکتی تھی
کرن ہو تیز تو تھی دھوپ واں سے ٹل جاتی
ظہور قدرتِ حق آنکھوں میں سمائے ہوئے
نہ دھوپ تیز نہ تاریک رات ہوتی تھی
اور اُس کی نوک نگہ میں کھٹک نہ سکتی تھی
بہت جو ہوتی اندھیری تو رات ڈھل جاتی

رواجِ عیب کا جلتا وہاں چراغ نہ تھا
تھا رات دن کا برابر تُلا حساب وہاں
ہوا کے واں چلن آکر درست ہوتے تھے
کبھی نسیم تھی آتی کبھی صبا آتی
کہ آب و رنگِ جہاں رونقِ بہار سے ہو
دُھواں بدی کا پہنچتا پئے دماغ نہ تھا
ہمیشہ رہتا تھا میزاں میں آفتاب وہاں
جو صرصر آئے تو زور اُسکے سُست ہوتے تھے
اور اس روش سے وہ پھولوں کو تھی سجا جاتی
یہ گُل کے پہلو کو صدمہ نہ نوک خار سے ہو

جو مار طبع تھے واں آکے سیدھے چلتے تھے
زیاد و کم کو وہاں اعتدال تھے گویا
جو بدمزاج تھے واں خوش مزاج ہوتے تھے
اور اُن کے تکلے کی مانند بل نکلتے تھے
جو بد تھے۔ نیک باصلاح حال تھے گویا
سبھوں کی کج روشی کے علاج ہوتے تھے

کنارِ کوہ پہ سورج تھا دیتا دکھلائی
کہ جیسے گیند طلائی ہوا میں لٹکائی
دکھا کے گوشۂ ابرو ذرا چمک جانا
لحاف ابر میں منہ دیکے پھر دبک جانا
کبھی پہاڑ پہ سر بھی ابھار لیتا تھا
شفق کے خون میں پھر غوطہ مار لیتا تھا
وہ دن جہاں میں تھا نوروز روزگار کا دن
جدھر کو دیکھئے گویا کہ تھا بہار کا دن
ہوا میں فیض مسیحا کی شان تھی گویا
کہ آتی قالبِ بیجاں میں جان تھی گویا
پڑے چھلکتے گلوں کے ایاغ تھے سارے
کھڑے لہکتے جوانانِ باغ تھے سارے
سحر کا فیض جو ہر خشک و تر پہ طاری تھا
تو آبِ بحر بھی کس مزے سے جاری تھا
دلوں کو موج کے دریا میں اضطراب نہ تھا
ہوا کے صدمہ سے رکھتا خطر حباب نہ تھا۔
نہ خوف لطمہ و گرداب غوطہ بازوں کو
نہ فکر بادِ مخالف کا تھا جہازوں کو
جو اپنی حد سے ہوا کچھ زیادہ ہوتی تھی
تو ناخداؤں کو بادِ مراد ہوتی تھی

زمین سبزۂ قدرت سے لہلہاتی تھی
صبا جو اس پہ گزرتی تو لوٹ جاتی تھی
تمام دشت چمن در چمن پڑے ہوئے تھے
پہاڑ پھولوں سے دامن بھرے کھڑے ہوئے تھے

شعاعِ مہر کا تھا ہر جگہ پہ کام جدا
ہر ایک کام میں کرتی تھی اہتمام جدا
ہوا میں پھیل کے مقیش تھی اڑا دیتی
زمیں پہ چادرِ مہتاب تھی بچھا دیتی
جگر میں شاخ کے پانی کو خوں بناتی تھی
اور اس کے خوں کو گلِ لالہ گوں بناتی تھی

نگاہ ایک سی تھی سوئے خشک و تر اس کی
گزر رہی تھی دلِ سنگ میں نظر اس کی
کبھی جو تھی نگہِ لطف سرسری کرتی
تو دل میں کوہ کے تھی کیمیا گری کرتی
کہیں جو سنگ کو گرمی سے تاب دیتی تھی
تو اس کو لعل و زمرد کی آب دیتی تھی

غرض کہ خلق میں دریا تھا فیض کا جاری
اور ان میں کارِ خدائی تھے جا بجا جاری

زیادہ سب سے قباحت یہ روبکار آئی
تو خاص و عام وہاں آکے باریاب ہوئے
اُنہی میں ہزل و تمسخر کے بھانڈ بھی آئے
لطائف اُن کے یہ دربار کو پسند ہوئے
رہے جو خلوت و جلوت میں روز و شب داخل
غرضکہ ہزل و تمسخر ہوئے وزیر اُس کے
اثر زمانے پہ اُس کا مگر بجا نہ ہوا
ادب کے طور طریقے بگڑ گئے اُن کے
رہا دِلوں پہ نہ رعب اُس کی حکمرانی کا
حیا و شرم و ادب سے خلاف کرنے لگے
ہر ایک بات میں چالاکیاں لگے کرنے
وہ محسن خلق تمسخر کا نام رکھتے تھے

کہ بزم جشن میں خلقت جو ایک بار آئی
سبھوں کو واں سے عطا خلعت و خطاب ہوئے
ظرافتوں نے بہت باغ سبز دکھلائے
کہ شہ کی خدمتِ عالی میں سربلند ہوئے
مصاحبوں میں ہوئے رفتہ رفتہ سب داخل
بہت سے اہلِ ظرافت ہوئے امیر اُس کے
جو اُس کو مدنظر تھا وہ مطلقاً نہ ہوا
قدم طریق وفا سے اکھڑ گئے اُن کے
سمجھ کے پی گئے سب اُسکو گھونٹ پانی کا
ادب کے قاعدوں سے انحراف کرنے لگے
حضور شاہ میں بے باکیاں لگے کرنے
جو بات کہتی نصیحت تو نام رکھتے تھے

یہ دیکھا خسروِ اخلاق نے جو حال اُن کا
اگرچہ خلق و مروت کا بادشاہ تھا وہ
پر اُس نے دیکھا کہ ان میں وفا نہیں باقی
رقم کیا ملک القدس کو یہ حال اُن کا
شتاب چشم کرم سے نگاہ ہو جائے

اور اُن کے حال نے دکھلا دیا مآل اُن کا
اور ایسی باتوں پہ رکھتا نہ کچھ نگاہ تھا وہ
اور اُن کی آنکھوں میں شرم و حیا نہیں باقی
لکھا کہ حال سراسر ہے پُر وبال اُن کا
کہ روئداد جہاں روبراہ ہو جائے

غرض جو بھی شہ اخلاق نے لکھی عرضی
وہاں نگاہ توجہ کمال اُسپہ ہوئی
بدوں کی ساری بداطواریاں بھی دیکھی گئیں

وہ بزم قدس میں ساری پڑھی گئی عرضی
بہت سی قدسیوں میں قیل و قال اُس پہ ہوئی
ظرافتوں کی ستمگاریاں بھی دیکھی گئیں

غرض کہ بزم مقدس میں گفتگو کر کے
ہر اک کے ظاہر و باطن میں جستجو کر کے

وہ شاہ لطف سے تھا کر رہا جہاں پہ نظر — کبھی عیاں پہ نظر تھی کبھی نہاں پہ نظر
خدا کے بندوں پہ اُلفت زبس تھی عام اُسکی — فروغِ عام تھی مثلِ مہِ تمام اُس کی
وہ جوشِ الفتِ دل کام کر کے پردہ میں — یکایک آنکھوں سے نکلا نظر کے پردہ میں
تھا حُسنِ خلق جو پھیلا رہا شمیم اُس کی — اسی پہ خاص ہوئی اُلفتِ عمیم اُس کی
دیا یہ حکم کہ تم سوے خلق جاؤ ذرا — ہمارے لطف کا جلوہ اُنہیں دکھاؤ ذرا
دلوں کی مملکتوں کا خراج اُس کو دیا — بہارِ گلشنِ جنت سے تاج اُس کو دیا
ہر ایک پھول کو سو رنگ و بو سے چمکا کر — اور اُس پہ شبنمِ آبِ حیات برسا کر
کیا بجانبِ مُلکِ فنا روانہ اُسے — کہ ہو قیامِ قیامت تلک فنا نہ اُسے

غرض کہ خسروِ اخلاق خلق میں آیا — شمیمِ خُلق سے باغِ جہاں کو مہکایا
یہ حُسنِ خلق سے تسخیر کر لیا سب کو — کہ جیسے بستۂ زنجیر کر لیا سب کو
بہارِ خلق سے اُس کے ہوا چمن عالم — اور اُس کے نور سے انجم کی انجمن عالم
شگفتہ روئی پہ صدقے بہار ہوتی تھی — دہن پہ خندہ جبینی نثار ہوتی تھی
وہ مُنہ سے بات جو کرتا تو پھول جھڑتے تھے — جو چپ رہے تو چمن آ کے پاؤں پڑتے تھے
کیا نہ دل میں بد و نیک کا خیال اُس نے — ہر اک کو کر دیا خوشحال حسبِ حال اُس نے
جہاں میں بحرِ کرم اُس کی ذات تھی گویا — وہ ذات چشمۂ آبِ حیات تھی گویا
رہا زبسکہ نہ محروم اُس ابرِ تر سے کوئی — پھرا نہ خلق میں ناکام اُسکے در سے کوئی
تو مدح خواں ہوئے سب اہلِ روزگار اُسکے — دئے زمانہ میں شہرت نے اشتہار اُس کے
اُمنڈ کے لوگ یہ نزدیک و دُور سے آئے — کہ جیسے مور و ملخ ہوں وفور سے آئے
وہ اُس کے بندۂ بے دام ہو گئے سارے — غلام خاص سے تا عام ہو گئے سارے

درِ اُمید کھُلا تھا ہمیشہ سب کے لئے — نہ حکم خاص تھا دن کا نہ قید شب کے لئے
اگرچہ بہرِ بد و نیک تھا کھُلا دربار — دلِ سخی کی طرح تھا ہمیشہ وا دربار

کھلا کہ ہو گئے بیباک یہ جو سارے ہیں
اور اُس میں سارے بداعمالیوں کے مارے ہیں
تو بے سبب نہیں گستاخیوں میں آئے ہوئے
یہ حُسنِ خلق کے ہیں سارے گل کھلائے ہوئے
سو قوتِ غضبی کو ذرا اشارا ہو
کہ ساتھ اس کے عمل میں حکومت آرا ہو
وہ حُسنِ خلق سے بل کر دوا کا کام کرے
جو دل مریض ہیں اُن پر شفا کا کام کرے

غرض کہ قہر کو فرمان خسروانہ ہوا
بلا کی طرح سے وہ دفعتہً روانہ ہوا
چلا وہاں سے مگر اس کڑک دمک سے چلا
کہ جیسے شعلۂ باروت ہو بھڑک کے چلا
بسانِ اژدرِ خونخوار سر اُٹھائے ہوئے
اور اُس پہ کلّۂ شیر سیہ چڑھائے ہوئے
قضا نے آگ کے سانچے میں اُسکو ڈھالا تھا
جلا ہوا تھا دل ایسا کہ رنگ کالا تھا
یہ تن پہ اینٹھے تھے غیظ و غضب کے مارے بال
کھڑے تھے شیر کی موچھوں کی طرح سارے بال
تھے مارے طیش کے نتھنے بھڑک رہے دونو
برنگ شعلہ تھے دیدے چمک رہے دونو
یہ پیچ و تاب میں تھا اپنے زہر کا مارا
کہ دانت پیستا آتا تھا قہر کا مارا
غضب سے چہرہ پہ گویا جنوں برستا تھا
جو دیکھتا تو نگاہوں سے خوں برستا تھا
گرج تھی ابر کی اور آندھی اُسکے ساتھ میں تھی
بجائے تیغ کڑک بجلی اُس کے ہاتھ میں تھی
خود اک بگولے کے اوپر سوار آتا تھا
غبار آگے اُڑاتا شرار آتا تھا

غرض کہ آیا اور اس آن بان سے آیا
کہ جیسے قہر خدا آسمان سے آیا
وہ اُس کا آنا جہاں پر غضب کا آنا تھا
نہ اُس کا نیک تھا اپنا نہ بد بیگانا تھا
پڑے تھے تہلکے دُنیا کے کارخانے میں
اور اُس کے آنے سے بھونچال تھے زمانے میں
وہ دونو ہزل و تمسخر جو تھے وزیروں میں
اور اُن کے ساتھ ظرافت کہ تھی امیروں میں
سب ایسے بھاگے کہ اُن کا کہیں نشاں نہ ملا
سرِ زمیں نہ ملا زیرِ آسماں نہ ملا
بہت سے لوگ مقام حساب میں آئے
بہت سے ترکِ ادب کے عتاب میں آئے
چٹخنے سب پہ ادب کے جو تازیانے لگے
تو مارے ڈر کے جگر سب کے تھرتھرانے لگے

ہزاروں قمچیوں سے پٹ کے فرشِ خاک ہوئے
ہزاروں خنجرِ تعزیر سے ہلاک ہوئے
بہت سے اپنے کئے کی سزاؤں میں آئے
بہت کئے نہ کئے کی بلاؤں میں آئے
پر اُس کے ڈر سے کوئی دم بھی مار سکتا نہ تھا
جو روتی آنکھ تو نالہ پکار سکتا نہ تھا

اگرچہ جو تھا جہاں میں غضب کا مارا تھا
اور اُس کا قہر جو تھا سب پہ آشکارا تھا
پہ شکوہ کر نہیں سکتے تھے زینہار اُس کا
نہ حال لکھتے تھے اخبار روزگار اُس کا

مگر وہ شاہ کہ تھا جس پہ کل کا حال کھلا
اور اُن کے حال میں اک اک کا تھا مآل کھلا
نہ اپنے بندوں کا یہ حالِ زار دیکھ سکا
نہ درد و غم سے اُنہیں دلفگار دیکھ سکا
کیا اشارہ یہ تہذیب کو کہ جاؤ ابھی
اور اعتدال پہ ان کے دلوں کو لاؤ ابھی

اُدھر سے جب یہ عنایاتِ خسروانہ ہوئی
تو بزمِ قدس سے تہذیب اِدھر روانہ ہوئی
وہ سوئے اہلِ زمیں ایسی شان سے اُتری
کہ جیسے رحمتِ حق آسمان سے اُتری
نہ اُس کے تاج دُرِ شاہوار تھا سر پر
نہ کوئی چترِ جواہر نگار تھا سر پر
مگر عمامۂ خاص اُس کو مشتری نے دیا
اور اپنا چتر تھا طالع کی یاوری نے دیا
تھے وہ جو علم نے خلعت اُسے پہنائے ہوئے
اور اُس کے قامتِ موزوں پہ ٹھیک آئے ہوئے
اثر عدو کے خدنگِ کلام کرتے نہ تھے
اور اعتراضوں کے تیر اُن پہ کام کرتے نہ تھے
کلام ہاتھ میں تھا آگے تیغِ تیز لئے
تھے جوہر اُس میں سخنہائے شعلہ ریز لئے
بناتی آتی تھی تدبیر سارے کام اُس کے
خرد بھی کر رہی پردہ میں انتظام اُس کے
تھی صنعت اپنے گلِ تر بکھیرتی آتی
اور اُن کا رنگ زمانہ پہ پھیرتی آتی
اُسی کے رنگ میں دولت بھی جگمگاتی ہوئی
کہ دونوں ہاتھوں سے تھی سیم و زر لٹاتی ہوئی

فلک سے جبکہ زمیں پر وہ نیک نام آئی
لئے جہان میں آرامِ خاص و عام آئی

وہیں محاسنِ اخلاق بڑھ کے ساتھ ہوئے
وہ آپ ٹپکتی آتی تھی تمکنت کی چھڑی
نہ بات ہر کس و ناکس سے تھی ذرا کرتی
جو حکم کچھ سرِ دربار برملا ہوتے
تھی دوربیں کی جگہ ہاتھ میں لئے اخبار
خلافِ وضع نہ تھی بات مطلقاً کرتی

جھکا کے غیظ و غضب سر کو ساتھ ساتھ ہوئے
کہ تمکنت کی چھڑی تھی وہ سلطنت کی چھڑی
وزیرِ عقل سے تھی گر تھی مشورا کرتی
تو اُس کی کم سخنی میں سخن ادا ہوتے
جہاں کی سیر تھے اُس کو دکھا رہے اخبار
ہنسی کے حق کو تبسم میں تھی ادا کرتی

غرض کہ پہلے ہی جو اُس نے جشنِ عام کیا
کہ مدرسے ہیں جو عالم میں جابجا جاری
کہ لڑکے یاں کے جو محنت زیاد کرتے ہیں
مگر دلوں پہ اثر اُن کے زینہار نہیں
اگر دلوں پہ اثر ہو تو کیوں عمل نہ کریں
یہ حکم آج سے ہو جائے عام عالم میں
کہ لفظ جیسے زبانوں پہ ہیں رواں ہوتے
اب ان کے ساتھ مطالب کے بھی اثر ہوویں

تو نظمِ خلق کا پہلا یہ انتظام کیا
یہ حکم اُن میں بتاکید ہو نیا جاری
زباں سے لفظ و معانی کو یاد کرتے ہیں
اور اُن پہ رکھتے یقیں اہلِ روزگار نہیں
بدی کو اپنی وہ نیکی سے کیوں بدل نہ کریں
اور انتظام ہو اس کا تمام عالم میں
یہ اُن کو منہ سے ہیں بک بک کے نیچاں ہوتے
دلوں میں انکے یقیں رہتے رہتے گھر ہوویں

یہ حکم جب ہوا دربارِ شاہ سے جاری
اِدھر اُدھر کو جو گھاتوں میں تھے لگے اخبار
ہوا یہ اتنے میں اک حکم دوسرا جاری
نہ ان کی باتیں زبانوں پہ منحصر ہوویں
کہ ان کا فیض مقاصد ہو عام عالم میں
ولیکن اُن کو بھی تاکید یہ زیادہ ہو
باتفاق اُسے مل جُل کے رد براہ کرو

ہوا انتما ابھی دفتر کی راہ سے جاری
وہیں زباں بزباں اُس کو لے اڑے اخبار
کہ جلسے انجمنوں کے ہیں جابجا جاری
وہ سب رسالوں میں چھپ چھپ کے مشتہر ہوویں
رہیں علوم کے چرچے تمام عالم میں
کہ فائدہ کی جو کچھ بات دل نہاں ہو
اور اختلاف سے کاموں کو مت تباہ کرو

مثنوی شرافتِ حقیقی

مَیں پوچھتا نہیں ہرگز تمہارا نام ہے کیا
نہ خانوادہ سے مطلب نہ خانماں سے غرض
تمہارے کام گر اچھّے تو نام اچھے ہیں

نہ یہ کہ نام بزرگوں کا اور مقام ہے کیا
یہاں تو نام سے کچھ ہے نہ ہے نشاں سے غرض
گھرانے اچھّے ۔ گھر اچھّے ۔ تمام اچھے ہیں

جہاں کی دولت و حشمت کا یاں خیال نہیں
کوئی امیر اگر ہے تو اپنے گھر بیٹھے
یہاں تو مایۂ ہمت ہیں جو زیادہ ہے

امیر ہو کہ فقیر اس سے کچھ سوال نہیں
بزرگ صاحبِ زر تھے تو لیکے زر بیٹھے
بزرگ امیر تھے اور خود امیرزادہ ہے

مجھے نہیں ہے یہ پروا کہیں سے آئے کوئی
جو پاک نہر ہے اور آب صاف چلتا ہے
درخت سے نہیں کچھ کام جسکے پھول ہو تم

کہیں سے بارِ تو طن اُٹھا کے لائے کوئی
تو کیوں یہ پوچھیں کہ چشمہ کہاں نکلتا ہے
کمال اصل تو جب ہے کہ با اصول ہو تم

عدم سے آن کے کس خاک پر گرے پہلے
گزارا تم نے لڑکپن ہے قصرِ شاہی میں
مجھے نہ فخر ہے اُس کا ۔ نہ عار ہے اِس کی
کہ رکھتے ملک مروّت میں رسم و راہ ہو کیا

وہ کیا زمین تھی جس پہ قدم پھرے پہلے
کہ جھونپڑوں میں پلے خواری و تباہی میں
مگر تلاش ہے تو بار بار ہے اس کی
دکھاتے ہمت عالی میں دستگاہ ہو کیا

میں پوچھتا نہیں تاجر کہاں سے ہے آیا
نہیں تلاش کہ لایا ہے ساتھ کیا چیزیں

گماشتہ ہے کہ رکھتا ہے گھر کا سرمایہ
سبک سبک ہیں و یا ہیں گرانبہا چیزیں

میں چاہتا نہیں ارزاں یہ شے دلادو مجھے
متاعِ حسن و دیانت دُکاں میں ہے کہ نہیں
خدا کے واسطے اتنا کوئی بتادو مجھے
وفا کی جنس بھی اس کارواں میں ہے کہ نہیں

یہ مانا میں نے کہ با عقل و ذی شعور ہو تم
نہ کچھ مقدرہ فہمی سے رکھتا کام ہوں میں
پر اُس کو خود غرضی میں نہ خرچ کرنا تم
زیادہ عقل زیادہ خراب کرتی ہے
مقام تجربہ کاری میں پہنچے دُور ہو تم
نہ کرتا ضابطہ دانی میں کچھ کلام ہوں میں
کسی کے خون میں ناحق نہ ہاتھ بھرنا تم
ثواب ہاے خدا کو عذاب کرتی ہے

مجھے غرض نہیں کالج میں تم پڑھے کہ نہیں
کتابیں پڑھ کے جو کیں حفظ بر زباں تو کیا
تمہارے خُلق پہ بھی کچھ اثر ہوا کہ نہیں
فقط جو عالم ذی شان ہوگئے تو کیا
جماعتوں کے مدارج پہ تم چڑھے کہ نہیں
اور اُن میں پاس ہوئے دیکے امتحاں تو کیا
زباں سے کہنے کی دل تک صدا گئی کہ نہیں
مرے حسابوں وہ شیطان ہوگئے تو کیا

جو کچھ کہ مُنہ سے کہو اُس کا لو اثر دل میں
زبان و دل ہیں ہم جب کہ ایک ہو جاتے
وگرنہ پڑھنے کو سب خاص و عام پڑھتے ہیں
کہ ہے کتابوں میں جو کچھ۔ کرو وہ گھر دل میں
تو آدمی بھی ہیں بالطبع نیک ہو جاتے
ہزاروں طوطے ہیں کلمہ کلام پڑھتے ہیں

جو مجھ سے پوچھو تو ہے پھر بھی ناتمام وہ علم
وہ علم جس سے کہ اَوروں کو فائدہ نہ ہوا
تمام جب ہو کہ پہنچائے فیضِ عام وہ علم
ہمارے آگے برابر ہے وہ ہوا نہ ہوا

مجھے غرض نہیں سب کچھ ہو تم۔ کہ کچھ بھی نہ ہو
میاں جلسہ جو آزاد پوچھے آ کے کبھی
کہ باصفا و سبک روح و پاک جاں ہم ہیں
مگر یہی ہے تمنّا کہ ایسے ہو کے رہو
کہو۔ کسی میں لیاقت ہو گر یہ کہنے کی
تو تم جواب میں جھٹ بول اُٹھو۔ کہ ہاں ہم ہیں

معرفتِ الٰہی

آؤ آزاد بیٹھے کیا ہو خموش
فصلِ گل آئی ہے بجوشِ و خروش

کیا پڑے کنجِ غم میں ہو بے کار
گل و گلشن کی چل کے دیکھو بہار

لطفِ صحبت بہم غنیمت ہے
میاں آزاد دم غنیمت ہے

چل کے دیکھو ذرا چمن کی سیر
گل و گلزار و یاسمن کی سیر

گرچہ بہرِ عوام کالانعام
لطفِ گلگشت ہو گیا بدنام

پر کرو دل میں تم جو اپنے غور
ہے ہر اک امر کا علیحدہ طور

نیک و بد پر اگر نظر ہے شرط
قصد کا اپنے بھی اثر ہے شرط

سیکڑوں چیزیں اس جہاں میں ہیں
کہ بُری خلق کے گماں میں ہیں

صرف ہووے گر اُس میں حُسنِ خیال
تو ہو پھر نقص اُس کا عین کمال

گل و سنبل سے تا خس و خاشاک
خاک سے تا بہ گلشنِ افلاک

رکھتے جو لوگ ہیں نظر عالی
نہیں عبرت سے کوئی شے خالی

ہر ورق ہے شجر پہ بہرِ حساب
بکفِ دست موعظت کی کتاب

گوش عبرت نہیں تو کھولتا ہے
ورنہ ہر برگ یاں کا بولتا ہے

ہر زبان برگ گوشِ دلِ گل ہے
تُو ہی مدہوش نشۂ مُل ہے

ایک دن دل جو میرا گھبرایا
کلبۂ غم سے میں نکل آیا

دِل تھا پژمردہ غنچہ وار مرا
ہوا گلزار میں گزار مرا

پھرتے پھرتے جو دل میں کچھ آیا
پا کے اک جا درخت کا سایا

بیٹھا میں بر کنارِ آبِ رواں
کہ ہے عمرِ رواں حباب رواں

کی جو یکبار آنکھ اُٹھا کے نظر
برگ اِک ٹوٹ کر ز شاخِ شجر

اُترا اُو پر سے جوں پیامِ سروش
اور ہوا میری زینتِ آغوش

گرچہ گویا نہ تھی زبانِ مقال
پر وہ کہتا تھا۔ فی لسان الحال

کہ اگر تجھ کو چشمِ بینا ہے
تو یہ قدرت کی لوحِ بینا ہے

نہیں مجھ میں ہے یہ رگ و ریشہ
دیکھ ان کو بہ چشمِ اندیشہ

صانعِ غیب کا ہے کار بدیع
کلکِ صنعت کا ہے نگار بدیع

روئے ہستی پہ تھا نہ نام مرا
تھا رگِ شاخ میں مقام مرا

فیضِ آب اور باد کی نرمی
اُس کی نرمی و مہر کی گرمی

مادرِ خاک سے ہوئے جو دوچار
رُوح جنبش میں آگئی یکبار

مُنہ کو گردِ عدم سے صاف کیا
سینۂ شاخ کو شگاف کیا

سبز کوپل تھا جب نکالا سر
پر وہ کوپل تھی غیرتِ گلِ تر

کھائی میں نے جو اس چمن کی ہوا
دیا شاخ و شجر کو برگ و نوا

میرا یمنِ قدم یہ آیا راس
ہوگیا ہر درخت خضر لباس

زاد و برگِ شجر ہوا مجھ سے
گل کا آباد گھر ہوا مجھ سے

بار مجھ بن نہ زینہار آتا
پہلے برگ آتا پیچھے بار آتا

تاج سر میں پڑے نہال ہوا
مجھ سے سارا چمن نہال ہوا

خسروِ گل کا جب قشوں آتا
میرا پرچم تھا پہلے لہراتا

سب کے سر پہ تھا نخل کا سایا
میرا سایا تھا نخل پر چھایا

جس سے سارے جہاں کو راحت تھی
ہر مسافر کو استراحت تھی

شاخِ گل تھی ہری بھری مجھ سے
زیب و زینت چمن کی تھی مجھ سے

تھے رفاقت سے میری سرو آزاد
مجھ سے زیبا تھا طرۂ شمشاد

چشمِ نرگس چمن کا جوبن تھی
برگ گویا زبانِ سوسن تھی

ساری ذات و صفات ہے مجھ میں
گل میں جو کچھ ہے بات ہے مجھ میں

کونسی بات مجھ سے چھوٹی ہے
مجھ میں اکسیر تک کی بوٹی ہے

مرہم زخم جان و خاطرِ ریش | برگ سبز است تحفۂ درویش

ہر خزاں کو بہار لازم ہے
ہست کو نیستی ملازم ہے

اُولوالعزمی کے لئے کوئی سدِّ راہ نہیں

ہے سامنے کھلا ہوا میداں چلے چلو | باغِ مراد ہے ثمر افشاں چلے چلو
دریا ہو بیچ میں کہ بیاباں چلے چلو | ہمت یہ کہہ رہی ہے کھڑی ہاں چلے چلو

چلنا ہی مصلحت ہے مری جاں چلے چلو

ہیں کوہ و دشت جیسے کہ پھولا پھلا چمن | دامن میں ہیں بھرے ہوئے نسرین و نسترن
نہریں اِدھر اُدھر ہیں امیدوں کی موج زن | اس دشت میں نہ دوڑ سکو بن کے گر ہرن

کبکِ دری کی طرح خراماں چلے چلو

آؤ کہ کھولے اپنے نشاں ننگ و نام نے | باندھی کمر ہے کَس کے ہر اک شاد کام نے
کیوں اس طرح کمر کو لگے تھک کے تھامنے | دیوار باغ وہ نظر آتی ہے سامنے

سروِ سہی کے سر ہیں نمایاں چلے چلو

یارو چلو چلو نہ کرو انتظار تم | کرتے ہو کیا امید یمین و یسار تم
میدان عزم و جزم کے ہو شہسوار تم | بڑھ جاؤ گے کرو گے اگر مار مار تم

چلا رہی ہے ہمتِ مرداں چلے چلو

ہمت کے شہسوار جو گھوڑے اُٹھائینگے | دشمن فلک بھی ہونگے تو سر کو جھکائینگے
طوفان بلبلوں کی طرح بیٹھ جائینگے | نیکی کے زور اُٹھ کے بدی کو دبائینگے

بیٹھو نہ تم مگر کسی عنواں چلے چلو

آئینہ دل کا گردِ سفر سے اُجال دو | پوچھے کوئی ارادہ کدھر ہے تو ٹال دو

شیطاں جو شبہ ڈالے تو دل سے نکال دو
ہو خوف کا خیال تو بزدل پہ ڈال دو
اور آپ بن کے شیر نیستاں چلے چلو

آگے بڑھو کہ اب نہیں تاب قرار ہے
کرنا ہے جبکہ کام تو کیا انتظار ہے
جو کچھ کہ معرکہ تھا لیا تم نے مار ہے
ہو تم بھی خوش کہ آئی خوشی کی بہار ہے
فتح و ظفر نے لیا میداں چلے چلو

رکھو رفاہ قوم پہ اپنا مدار تم
اور ہو کبھی صلہ کے نہ اُمیدوار تم
عزت خدا جو دیوے تو پھر کیوں ہو خوار تم
دو رُخ کو آب فخر سے رنگِ بہار تم
گلشن میں ہو کے باد بہاراں چلے چلو

یارو چلو فلک پہ ستارے ہیں چل رہے
آب رواں ہیں چشموں سے بہ کر نکل رہے
جنگل میں کارواں بھی ہیں منزل بدل رہے
جو تھم رہے یہاں وہی خر در وحل رہے
تھمنے کا یہ مقام نہیں ہاں چلے چلو

آؤ سیہ سفید کا فیصل حساب ہے
چمکایا چہرہ صبح نے با آب و تاب ہے
ظلمت پہ نور ہونے لگا فتحیاب ہے
اور شب کے پیچھے تیغ بکف آفتاب ہے
تم بھی ہو آفتاب درخشاں چلے چلو

نیکی بدی کے دیر سے باہم تھے معرکے
اب خاتموں پہ آگئے ہیں اُن کے فیصلے
قسمت کے یہ نوشتے نہیں جو نہ مٹ سکے
وہ گونجا طبل فتح کہ میدان لے لئے
ہے کرّنائے جنگ کی الحاں چلے چلو

سلام علیک

خدا کی نظر آ رہی شان ہے
سہانا سا اک سبز میدان ہے
ہوا سے جو سبزہ ہے لہرا رہا
تو ہے دیکھنے سے مزا آ رہا

ہری گھاس وہ لہلہاتی ہوئی — ہوا لوٹ کر لہر کھاتی ہوئی
کوئی دل جو سٹی میں ہے رل گیا — تو اک آدھ گل ہے کہیں کھل گیا
وہیں ایک پہلو میں تالاب ہے — کہ دن دھوپ اور رات مہتاب ہے
یہ سبزی اسی کے سہارے پہ ہے — درختوں کا جھرمٹ کنارے پہ ہے
لب آب جو ہیں شجر جھومتے — وہ ہیں جھک کے پانی کا منہ چومتے
سما آج کل ہے گا برسات کا — مزا دن کا ہے لطف ہے رات کا
درخت اک جگہ ہیں جو چھائے ہوئے — ہوادار بنگلے بنائے ہوئے
تو اک چھوٹے لڑکے نے واں آن کر — جگہ خوب موقعے کی پہچان کر
رکھا سامنے اپنا جزدان ہے — ورق پر لگائے ہوئے دھیان ہے
بہت لکھنے پڑھنے کا ہے ذوق اسے — یہی ذوق ہے اور یہی شوق اسے
ڈھلا ہیگا دن بج چکے چار ہیں — گئے سیر کو اس کے سب یار ہیں
ولیکن دمِ صبح یا شام ہے — شب و روز اسے کام سے کام ہے
اسی شغل میں اب بھی مشغول ہے — بنا بیٹھا اک مردِ معقول ہے
خدا جانے ہے ہاتھ میں کیا کتاب — کہ اس میں ہے ڈوبا چو ماہی در آب
اور آتی ہے جوں جوں سیاہی پہ شام — وہ شوقین لڑکا بذوق تمام
جھکا جاتا ہے اس طرح غور سے — کہ کاغذ میں کیڑا ہو جس طور سے
نظر اس کی جب ترمرانے لگی — سیہ شام سرمہ اڑانے لگی
بہت بیٹھے بیٹھے جو تھا تھک گیا — اک انگڑائی لے کر وہ لڑکا اٹھا
ملا کر بہم چھوٹے چھوٹے سے ہاتھ — کھلے چہرے پر لطف محنت کے ساتھ
تھا فارغ جو ہو کر اٹھا کام سے — تو بھولا برنگ شفق شام سے

لگا کہنے خوش ہو کے وہ خوش کلام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

رکھا پھر کتابوں کو جزدان میں — ٹہلنے لگا آ کے میدان میں

لگی ٹھنڈی ٹھنڈی جو مُنہ پر ہوا
تھے دن کے تھکے ماندے جو جانور
بہم مِل کے آوازیں دینے لگے
وہ مِل جُل کے آپس میں تھے بولتے
درختوں پہ چڑیوں کی چوں چوں کہو
جو سبزے میں جھینگر تھے برسات کے
کئی غول طوطوں کے چہکارتے
تھا لڑکا بھی حیراں یہ کیا ہو گیا
کلولوں میں سنّاٹے بھرتے ہوئے

حواس اس کے آئے ٹھکانے ذرا
وہ اپنے مقاموں پہ سب آن کر
بسیرے درختوں پہ لینے لگے
کہ اپنی خوش آوازیاں تولتے
جو سمجھو تو پھر یاد بے چوں کہو
دئے چھیڑ اُنہوں نے بھی سُر رات کے
گئے سبز سبز ایسے بل مارتے
کہ میداں کا سبزہ ہوا ہو گیا
وہ تھے اس طرح باتیں کرتے ہوئے

کہ خوش ہو کے بولا وہ رنگیں کلام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

کیا خاتمہ دن کا جب شام نے
اِدھر اور اُدھر کو نظر ڈالتا
کہ کچھ گائیں بھینسیں ملیں راہ میں
ٹپکتی خوشی صورتِ حال سے
بھرے دودھ سے تھن لٹکتے ہوئے
کئی ساتھ ساتھ ان کے گوسالے تھے
اور اک گلہ بان پیچھے آتا ہوا
ملیں راہ میں اُس کو کچھ بکریاں
کئی بربری ان میں گلزار تھیں
وہ دودھوں نہائی تھیں پوتوں پھلیں
پھُلروا سے بچّے اُچھلتے ہوئے
محبت سے ممیاتا جاتا کوئی

تو لی گھر کی راہ اُس خوش انجام نے
چلا جاتا تھا دیکھتا بھالتا
پھریں کھیت سے گھر کی تھیں چاہ میں
عجب جا رہی تھیں لٹک چال سے
کہ مشکیزے جیسے چھلکتے ہوئے
کہ ماؤں نے تھن کے تلے پالے تھے
تھا الغوزہ اپنا بجاتا ہوا
اور اک بوک بکرا رواں درمیاں
پہاڑی تو دودھوں میں سرشار تھیں
کہ دن بھر تھیں چر چگ کے گھر کو چلیں
تھے اٹکھیلیوں سے مچلتے ہوئے
بہت تھک کے ماں کو بُلاتا کوئی

انہیں دیکھ کر گھر کے شوقوں میں شاد — لگا کہنے خوش ہو کے وہ خوش نہاد

بھرو شیر مادر سے الفت کے جام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

وہ لڑکا جو پہنچا بنزدیک شہر — نظر آئی یاں اَور ہی لہر بہر
دوکانوں پہ روشن سراسر چراغ — چراغوں نے گویا لگائے تھے باغ
جو رونق کہ نیچے دوکانوں پہ ہے — کچھ اس سے سوا بالاخانوں پہ ہے
دکھاتے جو ہیں روشنی دُور سے — اُڑی جاتی ہیں کھڑکیاں نور سے
تصاویر و نقشوں سے گلزار گھر — طرحدار کمرے ہوادار گھر
کہیں مل کے بیٹھے ہیں کوٹھے پہ یار — کہیں شعر خوانی ہے گاہے ستار
غزل ریختے کی ہے گاتا کوئی — ہے گاتا کوئی اور بجاتا کوئی
لطیفوں پہ اُڑتے ہیں جو قہقہے — کہاں یاد بلبل کو یہ چہچہے
غرض ہر جگہ سے گزرتا ہوا — تماشے خدائی کے کرتا ہوا
گیا جب کہ گھر میں وہ روشن چراغ — تو ماں باپ بھی ہو گئے باغ باغ
خوشی سے نہ جامے میں پھولوں سمائے — بہن بھائی بولے وہ آئے وہ آئے
سلام اس نے پہلے کیا باپ کو — جھکایا بہ حسن ادب آپ کو

دُعا دی یہ اُس نے بھی لے کر سلام
مبارک مبارک خوشا وقت شام

بچھا صحن میں تھا بڑا سا جو تخت — وہاں آ کے بیٹھے وہ فرخندہ بخت
لگا سامنے آ کے دستار خواں — بہم کھا کھلا کر ہوئے شادماں
فراغت ہوئی کھانے پینے سے جب — بچھونوں پہ آئے قرینے سے تب
برابر برابر بچھے تھے پلنگ — پڑیں چادریں ان پہ مہتاب رنگ
فلک نیلگوں رنگ نکھرے ہوئے — ستارے تمام ان پہ بکھرے ہوئے
چمک کر چڑھا چرخ پر چاند تھا — کہ سورج کا منہ کر دیا ماند تھا

ادھر چاندنی نور پھیلا رہی — سیاہی اُدھر رنگ دکھلا رہی
وہ چھائی ہوئی رات تاروں بھری — کہ چادر ہو جیسے ستاروں بھری
پلنگڑی پہ لڑکا تھا لیٹا ہوا — کہ بیٹھا تھا شکّر لپیٹا ہوا
پدر تھا جو تاریخ کا رازداں — سناتا تھا ہر دم نئی داستاں
کبھی کرتا خود شعر خوانی تھا وہ — کبھی سُنتا ماں سے کہانی تھا وہ
دیا یہ مزا اُن حکایات نے — کہ انگڑائی گردوں پہ لی رات نے
ہوا۔ آکے پنکھا ہلانے لگی — ہر اک کو غرض نیند آنے لگی
تھکے ماندے دن بھر کے تھے ہو رہے — دوپٹے لئے تان اور سو رہے
بیاں کیا کروں رات کی شان کا — زمانہ میں عالم وہ سنسان کا
پڑا نیند میں مست سارا جہاں — نہ تھے چور باقی نہ تھے پاسباں
پڑے سوتے سب ایسے مدہوش تھے — کہ گھڑیال تک بھی تو خاموش تھے
درختوں میں تھیں جو گزرتی ہوائیں — زمانہ پڑا کرتا تھا سائیں سائیں
شبِ تار بھی نیند میں آن کر — سیہ چادر اپنی پڑی تان کر
ہمیشہ زمانے کا دستور ہے — اندھیرے سے کرتا عیاں نور ہے
کہ چمکا ستارہ سحر گاہ کا — ہوا رنگ پھیکا رُخِ ماہ کا
ستاروں کی آنکھیں جھپکنے لگیں — تعجب سے مشرق کو تکنے لگیں
شبِ تار کا رنگ فق ہو گیا — چراغِ سحر جاں بحق ہو گیا
ہوئی یک بیک روشنی سی نمود — اُبلنے لگا دیگِ مشرق سے دود
سحر کے جو عالم نمودار تھے — دھوئیں اُڑ رہے تھے شبِ تار کے
لگے بولنے سب سحر کے طیور — گئی اُن کی آواز نزدیک و دُور
وہ لڑکا جو تھا بسترِ خواب میں — ستارہ ہو جوں چادرِ آب میں

اُٹھا کر کہا اس نے تکیہ سے سر
سلامٌ علیکم مبارک سحر

جسے چاہو سمجھ لو

قلم مرقّع عبرت نیا دکھاتا ہے
اور ایسے شخص کا اک ماجرا سناتا ہے

کہ سب تمہارا سا تھا کارخانہ اُس کے لئے
یہی زمیں تھی یہی تھا زمانہ اُس کے لئے

فنا کے سایہ میں کرتا وہ زندگانی تھا
جو پوچھو کون؟ تو سمجھو تمہیں سا فانی تھا

مٹایا گردشِ گردوں نے آہ نام اُس کا
نہ آج نام ہے اُس کا۔ نہ کچھ مقام اُس کا

پر اتنا سچ ہے کہ غمگین و شاد ہونے سے
خوشی کے ہنسنے سے اور درد و غم کے رونے سے

کبھی اُمید سے اور گاہ نااُمیدی سے
کبھی خطر کی خبر گاہ خوش نویدی سے

جو ایک رنگ تھا آتا تو ایک جاتا تھا
خیال اس کا مرقّع نیا بناتا تھا

یہ دل جو سینہ میں جنبش ہے دمبدم کرتا
کہ ہے اسی پہ ہر اک زندگی کا دم بھرنا

دماغ میں جو خیالوں کا آنا جانا ہے
کوئی یقیں ہے کوئی وہم کا فسانہ ہے

ہمارے ہمّت عالی کا اوج پر جانا
کبھی بجبر کبھی خود بخود اُتر آنا

غرض اُٹھاتا یہ کیفیتیں ضرور تھا وہ
کہ آخرش یہی انسان باشعور تھا وہ

جو تم ہو دیکھ رہے وہ یہ سب ہے دیکھ چکا
جہاں کے شام و سحر روز و شب ہے دیکھ چکا

جو کچھ کہ سہتے ہو تم آج سہہ چکا ہے وہ
جو کچھ کہ آج ہو تم ایسا رہ چکا ہے وہ

مگر میں کیا کہوں مُجھ کو تو اب یہ رونا ہے
کہ جو وہ آج ہے اک دن وہ تم کو ہونا ہے

یہ روز و شب کہ مہ و سال کے حساب میں ہیں
یہ سال و ماہ جو موسم کے انقلاب میں ہیں

بہت سے میوے بہت سے اناج دیتے ہیں
بہاریں سرِ سبزہ کو تاج دیتے ہیں

یہ فرش خاک کہ سب کاروبار ہیں جس پر
جب اُس کے طوق گلو زندگی کا قصّہ تھا
یہ سب کچُھ اب بھی ہے پر اس کو کچُھ خبر بھی نہیں
بلا سے اس کی زمانہ ابھی فنا ہو جائے
وہ آپھی جب نہ ہوا پھر جہاں ہوا نہ ہوا

یہ ابر و باد کہ سارے مدار ہیں جس پر
تو ساری محنتوں سے لیتا اپنا حصّہ تھا
جو ہو تو نفع نہیں گر نہ ہو ضرر بھی نہیں
ویا کہ ملک فنا گلشنِ بقا ہو جائے
زمیں ہوئی نہ ہوئی آسماں ہوا نہ ہوا

یہ صبح و شام جو ٹھنڈی ہوائیں آتی ہیں
یہ مہر و ماہ کہ جن سے جہان روشن ہے
کسی میں دور کا اسکے نشاں نہیں باقی
قضلنے لیکے الٰہی کہاں چھپایا اُسے

یہ سال و ماہ کی فصلیں جو آتی جاتی ہیں
ستارے جن سے زمین آسمان روشن ہے
پتا تلک بھی تہِ آسماں نہیں باقی
زمین کھا گئی یا آسماں نے کھایا اُسے

کسی کے حُسنِ پریوش کا وہ دیوانہ تھا
پر اب جو دیکھو تو وہ غیرتِ پری بھی نہیں
فنا کے بزم میں ساقی نے اُس کو جام دیا
طبیب آئے تھے لیکن کوئی دوا نہ چلی
فلک نے موت کا جام آخرش پلایا اُسے

اور اُس کے تیر ادا کا ہوا نشانہ تھا
وہ اُس کے ناز وہ انداز دلبری بھی نہیں
مرض کا نام کیا موت کا پیام دیا
خود آیا حُسن سفارش کو پر ذرا نہ چلی
دہانِ گور سے گویا زمیں نے کھایا اُسے

ازل کی صبح کہ جب میں جہاں ہوا پیدا
کتاب عمر جہاں آج تک پڑھی میں نے
ہر اک کا راز ہے اُس میں کہیں کہیں کھُلتا

اور اُس کے ساتھ ہی گویا ہوئی فنا پیدا
ورق ورق ہے یہ تاریخ دیکھ لی میں نے
پر اُس غریب کا احوال کچُھ نہیں کھُلتا

بہت ہوں فکر سے کہتا کہ کچُھ بتا تو سہی
ہے وہ بھی اتنا ہی کہتا کہ کوئی تھا تو سہی

جغرافیۂ طبعی کی پہیلی

جو منشی ذکاء اللہ صاحب پروفیسر نے بافہمائے مشرقی
کی فرمائش سے نظم کی گئی تھی

ہنگامۂ ہستی کو
ہر خشک و ترِ عالم
جو خاک کا ذرہ ہے
حکمت کا مرقع ہے
انداز سے ہے جاری
اک رنگ کہ آتا ہے

گر غور سے دیکھو تم
صنعت کے تلاطم میں
یا پانی کا قطرہ ہے
جس پر قلمِ قدرت
اور کرتا ہے گلکاری
سَو رنگ دکھاتا ہے

اور دیکھنے والوں کی
خرمہرۂ رنگیں - یا
ہر لحظہ و ہر ساعت
عالم میں پڑے ہوتے
ہرگز کہ یہ سب کیا ہے

آنکھیں تو کھلی ہیں پر
بلّور کے ٹکڑے ہیں
قدرت کے تماشے ہیں
پر اُن کو نہیں پروا
اور ہے تو سبب کیا ہے ؟

ایسے بھی مگر اکثر
جو کھولے ہوئے ہردم
ذرّہ ہو کہ ہو سورج

ارباب بصیرت ہیں
ہیں دیدۂ عبرت کو
معنی ہو کہ ہو صورت

ہر جلوۂ قدرت میں
سرمایۂ بینائی
یہ آنکھ پہ ٹھیک آئی
گرمی ہو و یا سردی
حکمت کا معمّا ہے
نقطہ ہے اگر اُس میں
عقدہ ہے اگر اُس میں

سُرمہ اُنہیں حکمت کا
اور عینک عبرت ہے
جس سنے کہ زمانہ کی
یا ہووے تری خشکی
قدرت کی پہیلی ہے
ہے عقدۂ سربستہ
ہے نکتہ برجستہ

اک سیدھی سی بات اس وقت
وہ یہ ہے کہ دو چیزیں
آپس میں جو رکھتی ہیں
اولاد سے جن کی سب
نقلی نہیں افسانہ
اور پھر اُنہیں دونو کو
ماں بیٹی کا ہے ناتا
شورشگہِ عالم میں
اصلوں کی بہت نسلیں
اس پیچ کا پر رشتہ

آئی ہے تصوّر میں
کیا ایسی ہیں دُنیا میں
پیوندِ زناشوئی
آباد زمانہ ہے
سب نے اسے مانا ہے
دیکھو جو نظر بھر کر
دونو ہیں نظر آتا
پیدائشیں لاکھوں ہیں
رشتوں کے سررشتے ہیں
دیکھا نہ سُنا کوئی

آزاد۔ بھلا ہے کون
یا بند گرہ کھولے
کہہ سُن کے سوال اپنا

جو آگے ترے بولے
ہاں یہ کہ مگر تو ہی
دے آپ جواب اپنا

وہ دو کہ بہم جن میں
عالم میں ہیں دو جوہر
صنعت گہِ قدرت میں
سب عالمِ جسمانی

ہے عقد زن و شوہر
خشکی و تری جن سے
پیدا و ہویدا ہیں
حیوانی و انسانی

اور دوسرے رشتہ سے
تو دیکھ لو پانی کو
بادل ہو کہ ہو باراں
شبنم سے بھی کم ہووے
اک عرصۂ خاص اُس پر
خشکی کے نشاں ہوتے
یا بچے ہیں۔ جو ماکی

گر غور کرو دل میں
جس رنگ میں جی چاہے
قطرہ ہو و یا دریا
یا نام کو نم ہووے
گزریگا تو دیکھوگے
اس میں سے ہویدا ہیں
آغوش میں پیدا ہیں

کیوں قبلۂ من دیکھا
کیا بوجھے کوئی پنڈت
ہاں سمجھیں میاں آزاد
سنبل ہے یہ سبزہ میں

یہ طرفہ معمّا ہے
یا فلسفی و مُلّا
یا منشی ذکاء اللہ
پھولوں میں چنبیلی ہے

کون اس کو بھلا بوجھے
حکمت کی پہیلی ہے

مُبارکباد جشن جوبلی

اے خوشی آ۔ ترے آنے سے زمانہ روشن
آ۔ کہ تو آپ ہے روشن ترا آنا روشن
اے خوشی آ۔ ترے آنے سے ہے گھر گھر شادی
ہے ترے آنے سے ہر لب پہ مبارکبادی
یاد میں بیٹھے تھے یاران دل آگاہ تری
سالہا سال سے تھے دیکھ رہے راہ تری

ہم خوشی اُس کو نہیں کہتے جو ہر سال آئے
خلعت عید میں ہنستی ہوئی خوشحال آئے
کبھی عید رمضاں ہو کبھی عید قرباں
ہاتھ پھیلائے گلے ملتے ہوں بڈھوں سے جواں
عیدیاں بانٹ کے بچّوں کے جو دل شاد کرے
ہول و ہنگامہ سے بازاروں کو آباد کرے

خوشی اُس کو بھی نہیں کہتے جو نوروز سے ہو
گل و گلشن کے لئے جشن دل افروز سے ہو
سبزہ و گل میں عیاں عالم نیرنگ کرے
خاک کو سبز کرے سبزہ کو گلرنگ کرے

وہ خوشی کیا کہ ہو رخ جس کا فروزاں شب کو
اور دوالی سے کرے جشن چراغاں شب کو
جابجا ساتھ کھلونوں کے مٹھائی بانٹے
کہیں آنا کہیں پیسا کہیں پائی بانٹے
خوشی اُس کو نہیں کہتے جو کرے نام سے خوش
امتحاں لے کے کرے بچّوں کو انعام سے خوش

وہ خوشی کیا کہ جو گھر بیٹھ کے ہم آپ کریں
ہر برس سالگرہ بچّوں کی ماں باپ کریں

ہے حقیقت میں خوشی وہ کہ بافضال خدا
ہند پر قیصرۃ الہند ہوں فرماں فرما
جب باقبال و حشم گزریں اُسے سال پچاس
جابجا جشن خداساز کے ہوویں اجلاس۔

ہووے لاہور میں دربار نشاط و شادی ۔ اور پڑھے اُن کے آزاد مبارکبادی

یہ خوشی وہ ہے کہ دل جس سے ہیں خنداں خنداں ۔ یہ خوشی وہ ہے کہ ہو عید بھی قرباں قرباں
ہے خوشی عام دلوں کے لئے اور جاں کے لئے ۔ یہ خوشی عام ہے ہندو و مسلماں کے لئے
کہتے ہیں بندۂ بے دام و درم حاضر ہیں ۔ اور اگر جان کا موقع ہو تو دم حاضر ہیں
کہ وہ سارے تھے جو ادبار کے مارے پھرتے ۔ اور سعادت پہ نہ تھے اُنکے ستارے پھرتے
سرپرست اُن کا نہیں کوئی زمانہ میں رہا ۔ حال باقی نہیں کچھ اُن کے فسانہ میں رہا
اس برس پرورش عام جو مبذول ہوئی ۔ واسطے اُن کے بھی تدبیر ہے معقول ہوئی

ہوئی مشہور زمانہ میں جو یہ خوشخبری ۔ گھر بہ گھر دل کی اُمیدوں نے ہے کی جلوہ گری
کہیں ساماں ہے کہیں بے سر و ساماں خوش ہیں ۔ یہ خوشی وہ ہے کہ ہندو و مسلماں خوش ہیں

رات درگاہِ الٰہی میں دُعا کرتے ہیں ۔ دن کو پھرتے ہیں تو شکرانے ادا کرتے ہیں
ان میں ہے بندۂ آزاد یہ کہتا بہ نیاز ۔ حضرت قیصرۃ الہند کی ہو عمر دراز
اُن کے فرزند سدا خرّم و دلشاد رہیں ۔ اُن کی اولاد سے آبادیاں آباد رہیں

جاری اس جشن مبارک کا سدا دور رہے
روش گردش دولاب یہی طور رہے

ایک تارے کا عاشق

اک سخنور کسی تارے کا تماشائی تھا ۔ اُس کے دیدار کا دلدادہ و شیدائی تھا
دل سے وہ چاند کا ٹکڑا اُسے بھایا ہوا تھا ۔ اور وہی رات دن آنکھوں میں سمایا ہوا تھا

وہ ستارا کہ ہوا آنکھوں کا تارا تھا اُسے
چشمِ حیرت میں نظارے کا سہارا تھا اُسے

اوجِ معنی سے مضامیں تھا اُتارا کرتا
اور اُنھیں اپنے ستارہ پہ تھا وارا کرتا

چشمِ حیرت سے نظر اس پہ سدا کرتا تھا
دل کے سب راز و نیاز اس سے ادا کرتا تھا

غم جو اک شب اسے بے تاب و تواں کرنے لگا
مُنہ ہی مُنہ میں یہ سخن اس سے بیاں کرنے لگا

ہے تو تو رشکِ پری غیرتِ صد حور ہے تو
مگر اس عاشقِ دلدادہ سے کیوں دُور ہے تو

مُنہ ترا مہر صفت ہے گا چمکتا پیارے
سرد مہری سے مگر کیوں ہے جھپکتا پیارے

اے وہ تو جس پہ کہ قابو کی کوئی بات نہیں
چشمِ حسرت کے سوا حرف و حکایات نہیں

قطعہ

ہیں جو ارمان بھرے دل میں نکالوں کیونکر
ہائے چھاتی سے تجھے اپنی لگالوں کیونکر

دم نکل جائے تو ہو یار مبارک مرنا
یوں ہو مرنا تو ہے سو بار مبارک مرنا

اپنے تارے کو جو حسرت سے یہ تکتا تھا پڑا
جامِ دل جوشِ محبت سے چھلکتا تھا پڑا

آدمیت اُسے تب اُس کے خیالات نے دی
دفعۃً جنبش ادھر شوقِ ملاقات نے دی

بن کے عورت کششِ عشق کی ماری آئی
آسماں چھوڑ زمیں پر وہ بچاری آئی

بولی پھر اُس سے کہ اے شاعرِ شیدا میرے
شوقِ دیدار تھے دل میں ترے کیا کیا میرے

کششِ شوق نے تیری مجھے بلوا ہی لیا
تو وہ عاشق ہے کہ آخر کو مجھے پا ہی لیا

یہ تو بتلا کسی عورت کی ہے چھاتی اچھی
یا کرن تارے کی شب کو نظر آتی اچھی

سُنی شاعر نے جو یہ بات تو شرمایا بہت
بلکہ شرمایا نہیں جتنا کہ پچتایا بہت

بولا افسوس وہ تارا جو اُڑاتا تھا مجھے
اوجِ افلاک پہ کھینچے لئے جاتا تھا مجھے

آج وہ نورِ فلک ہاتھ سے کھویا میں نے
بولی وہ اپنا بھی کام آج ڈبویا میں نے

تو نے گردوں پہ چمکتا ہوا تارا کھویا
میں نے یاں عاشقِ شیدا سخن آرا کھویا

محنت کرو

ہے امتحاں سر پہ کھڑا۔ محنت کرو محنت کرو
باندھو کمر بیٹھے ہو کیا۔ محنت کرو محنت کرو

بیشک پڑھائی ہے سوا۔ اور وقت ہے تھوڑا رہا — ہے ایسی مشکل بات کیا۔ محنت کرو محنت کرو

شکوے شکایت جو کہ تھے۔ تم نے کہے ہم نے سُنے — جو کچھ ہوا اچھا ہوا۔ محنت کرو محنت کرو

محنت کرو انعام لو۔ انعام پر اکرام لو — جو چاہو گے مل جائیگا۔ محنت کرو محنت کرو

جو بیٹھ جائیں ہار کر۔ کہدو انہیں للکار کر — ہمت کا کوڑا مار کر۔ محنت کرو محنت کرو

تدبیریں ساری کہہ چکے۔ باتوں کے دریا بہہ چکے — بک بک سے اب کیا فائدہ۔ محنت کرو محنت کرو

یہ بیج اگر ڈالو گے تم۔ دل سے اسے پالو گے تم — دیکھو گے پھر اسکا مزا۔ محنت کرو محنت کرو

محنت جو کی جی توڑ کر۔ ہر شوق سے مُنہ موڑ کر — کر دو گے دم میں فیصلہ۔ محنت کرو محنت کرو

کھیتی ہو یا سوداگری۔ ہو بھیک یا ہو چاکری — سب کا سبق یکساں سُنا۔ محنت کرو محنت کرو

جس دن بڑے تم ہو گئے دُنیا کے دھندوں میں پھنسے — پڑھنے کی پھر فرصت کجا۔ محنت کرو محنت کرو

بچپن رہا کس کا سدا۔ انجام کو سوچو ذرا
یہ تو کہو۔ کھاؤ گے کیا۔ محنت کرو محنت کرو

قصیدہ در تہنیت ولادت جناب امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام

جہاں کی شادی و غم کا نہ کر خیال آزاد — کہ عیش و عشرتِ عالم ہے موج جنبش باد

بدلتی رہتی ہے ہر دم ہوا زمانہ کی — کبھی صبا کبھی صرصر کبھی ہے گرد باد

ہمیشہ رہوتے اگر ایک حال پر عالم — تو کہوے کون کہ حادث ہے عالم ایجاد

ہیں ایک دم میں بدلتے جہاں کے سو سو رنگ — عجب بنا پہ ہے بُنیاد قصر سبع شداد

نہ ہیں خزائنِ قاروں نہ ملک دقیانوس — نہ بوستان ارم ہے نہ قصر ذاتِ عماد

نہیں فساد سے خالی کبھی یہ دارِ حدوث — کیا ہے عالم فانی بنائے کون و فساد

ہوا کے گھوڑے پہ جاتے ہوں جو سلیماں وار — ہوں دم میں فرش زمیں جوں سطیح مادر زاد

کہاں ہے لشکرِ عاد اور کہاں ہے قومِ ثمود
کہاں ہے لشکرِ فرعون و جاہ ذی الاوتاد

کہاں ہے مملکتِ بخت و نصر و اسکندر
کہاں ہے شوکتِ ہامان و نخوتِ شداد

کہاں ہے حکمتِ لقمان و عقلِ اسطالیس
کہاں ہے خم فلاطون و گنبدِ فولاد

ہے آبِ آئینہ خاک دہانِ اسکندر
ہے زرد روئیِ قاروں شہیرِ شہر و بلاد

وبال دوش ہے زیرِ زمیں بھی بارِ عذاب
کہ بخت و نصر کو بختی کہے ہے لعنت باد

کہاں ملاحتِ لیلا و خوبیِ عذرا
کہاں ہے لعبتِ چینی و دلبرِ نوشاد

وہ سرو ناز ملے بس کہ خاک میں یکسر
اسی الم سے پریشاں ہے طرۂ شمشاد

نہ کیونکہ ناطقہ ہو سرمہ در گلوے بیاں
کہ دیوے کوہ جواب اور نہ دے صدا فرہاد

جو ملک ہو ویں جہاں وسعت وارم تزئیں
جو قصر ہو ویں فلک رفعت و جبل بنیاد

وہ اہل فہم و فراست وہ اہل علم و کمال
کہ ہو ویں عقل میں پیرِ فلک کے بھی اُستاد

مٹادے نام و نشاں اُن کا لوحِ ہستی سے
بسیل حادثہ اس طرح چرخِ زشت نہاد

کہ جیسے مل گئی آنکھوں کے آگے خاک میں ہے
سوادِ دہلی و جمعیتِ جہاں آباد

اگرچہ ذکرِ گزشتہ فضول ہے لیکن
ہوں آمدِ سخن اتنا ذرا دلانا یاد

کہ وہ زمانہ بھی ہے یاد تم کو حضرتِ دل
جو ایک جا پہ تھے ہم اور تم کہیں آباد

عجب مزے سے گزرتی تھی زندگی باہم
کہ تم بھی شاد تھے عالم میں اور ہم بھی شاد

نہ ہم کو جان کا ڈر تھا نہ تم کو مال کا غم
نہ ہم کو فکرِ معاش اور نہ تم کو فکرِ معاد

نہ ہم اسیرِ محبت نہ تم اسیرِ بلد
جو تم ہر امر میں بے قید تھے تو ہم آزاد

کہ اس میں آئی رجب کی جو تیرھویں تاریخ
ہجومِ عیش سے عالم ہوا نشاط آباد

ہوائے عیش و طرب سے برنگ غنچۂ گل
ہوئے شگفتہ دل مومنانِ نیک نہاد

زہے نشاط کہ پہنچے بگوش چرخِ بریں
صدائے تہنیت شادی و مبارکباد

ہوئے سب انجمن آرا جو آکے اک جا پر
تو تنگ ہوگیا میدان گلشنِ ایجاد

اور اُن میں آن کے مانند عندلیب بہار
ہوئے وہ زمزمہ پرداز ہم علے الاشہاد

کہ کہتے اہلِ زمیں تھے زمیں پہ صلِّ علےٰ
فلک پہ کہتے تھے اہلِ فلک کہ رحمت باد۔

یہ اب خدا نے وہی دن جہاں میں دکھلایا
پڑی ہے از سرِ نو طرحِ عیش کی بُنیاد

ذلا جو کچھ کہ تھا سرمایۂ بساطِ جہاں
اگرچہ صرصرِ آفت نے کر دیا برباد

کہ جی کو صبر ہے نہ تن میں جاں نہ چشم میں خواب
کہ میں ستم زدہ ہوں ناشکیب و تو ناشاد

بصدقِ دل سے ہے گر دعوئے ولائے علی
تو دیکھ پیرِ طریقت کا بھول مت ارشاد

خوشی کو چھوڑ کے گر غم میں اہلبیت کے غم
غم اپنا بھول کے شادی میں اُن کی ہو دلشاد

رہا نہ جبہ و دستار اگر سرو بر میں
تو کہہ دے ہو کے سبکدوش دردِ سر کم باد

چمن سے گرچہ جدا ہو کے ہے غرابُ البین
مگر صدا کو نہ بھول اپنی کر خدا کو یاد

کہ اپنا فخر تو ہے بندگیٔ آلِ نبی
ہے اپنا کام تو مدحِ ولیٔ ربِّ عُباد

نہ بھولے ہانک کبھی اپنی بلبل و قمری
قفس ہو یا سرِ گلبن ہو یا نہ شمشاد

نہ جائے مر کے بھی اہلِ ہنر کا جوہرِ طبع
کہ کشتہ ہو کے بھی ہے قاطعِ مرض فولاد

غرض حضور میں ہوتا ہوں چل کے مدح سرا
کہ بزمِ دہر میں ہے عیدِ فرحتِ میلاد

پڑھوں وہ مطلعِ پرنور رشکِ صبحِ بہار
کہ جس کو سُن کے زرِ گل پہ بیٹھے گرد کساد

پڑھوں وہ مطلعِ پرنور میمنت آمود
کہ جس کو پڑھ کے ملک دیں بہم مبارکباد

عجب نہیں ہے کرے گر باعتقاد تمام
برائے وردِ شب و روز اس کو قنبر یاد

وہ یہ ہے مہرِ عقیدت کا مطلعِ پرنور
کہ ہو وے مطلعِ صبح و ظائف و اوراد

تو وہ امام کہ تو نے مجھے کیا آزاد
ہیں وہ غلام کہ ہوں اب بھی بندۂ منقاد

نہ کیونکہ دونو گھر آباد تجھ سے ہوں کہ ہے تو
خدا کے گھر کا چراغ اور رسول کا داماد

نہ کیوں کہ ارض و سما تجھ پہ ہوں فدا کہ ہے تُو
نبی کا نائب و روح الامین کا استاد

تو وہ ہے جوہرِ اوّل کہ تیری ذاتِ شریف
پئے وجود دو عالم ہے علّتِ ایجاد

تو ہے ائمۂ دینِ ہدیٰ کا راس رئوس
تو انبیائے سلف کا فلذۃ الاکباد

شہا جو فیض کرم ہو ترا بہار افشاں
تو رشکِ گلشنِ جنت ہو گلخنِ حداد

جو تیرا دستِ حمایت ہو حامیٔ ضعفا
تو ٹوٹے بیضۂ قمری سے بیضۂ فولاد

جو تیرے خوف سے قالب تہی کریں ظالم
نیام خنجرِ بیدم ہو خنجرِ فولاد

زمیں سدا رہے پھرکی کی طرح گردش میں – جبال حلم ترے گر نہ اس میں ہوں اوتاد
ترے مصالح حکمت جو دیویں استحکام – حباب بحر ہوں رشک بروج سبع شداد
جو پا فتادوں کا عالم میں دستگیر ہو تو – تو نخل تاک ابھی اُٹھ کھڑا ہو جوں شمشاد
نہ ہو امامت اگر تجھ سے مستند شاہا – کتاب دہر سے ہوں محو معنیٔ اسناد
شہا نہ عدِ فضائل ہو تیرا عشرِ عشیر – ہزار بار ہوں قاصر مراتب اعداد
کہ ہر عمل میں سر فرد عقل ہندسہ داں – الوف ہوویں مات اور مآت ہوں احاد
وہ نور حق ہے تو اے فخر دودۂ آدم – کہ ہے بدیہ عیاں شکل جامع الاضداد
ترا ثبوت فضائل ہے کسر شان ترا – رواج عالم خاکی میں تیرا عین کساد
مقابلہ کس و ناکس سے تیرا عالم میں – مثال آئینۂ مہر و کور مادر زاد
کہ ذات حق سے ہے تو وصل مثل جوہر فرد – نہ وہ خذف کہ جو ہوویں ثلاثۃ الابعاد
شہا منازل دُنیا سے کام کیا تجھکو – ترے غلام ہیں قید دو کون سے آزاد
سر نیاز رکھیں ہیں جو سنگ در پہ ترے – نہ ماریں بھول کے ٹھوکر بتاج و تخت قباد
رہینگے دامن دشت نجف میں ہو کے غبار – بلا سے خاک میں گردوں دیا کرے برباد
ہزار ظلم سہیں لیک تیرے در کے سوا – کہیں نکالیں نہ دست تظلم و فریاد
فلک سے آگ بھی برسے تو مُنہ سے اُف نہ کریں – کہ سلسبیل سے پلتے ہیں آب یہ شمشاد
ولائے ساقی کوثر سے ہو کے مست الست – خمار دہر سے بیخود ہیں ہر چہ بادا باد
پر اب نگاہ کرم چاہئے ہے یا مولا – غلام خاص سے ہے منتخب یہ خانہ زاد
غلام کا تو شہا کام ہے خطا کاری – تمہاری ذات سے عفو و کرم کی ہے بُنیاد
بس اب کرم کی نظر کیجئے برائے حسین – شہید و تشنہ فولاد و خنجر بیداد
نہ آستانۂ دولت سے رکھئے دُور مجھے – کہ مشت خاک ہے عالم میں دربدر برباد
مرا تو عقدۂ مشکل رہے حضور کے ہاتھ – پڑے نہ دست خلائق میں اسکے بست و کشاد
جو کچھ کہ گزرا ہے سب ہے حضور پر روشن – کہ گھر تباہ ہوا اور خانماں برباد
یہ لاکھ شکر کہ ثابت قدم ہے دل اب تک – اگرچہ سیل حوادث نے توڑدی بُنیاد

ہوا ایسے حال ہیں پر خاک زندگی کا لطف
زمانہ برسر کیں چرخ برسر بیداد

نہیں ہے قطرۂ خوں دل ہیں نام کو لیکن
ہیں اشک چشم رواں مثل دجلۂ بغداد

زبس یگانہ و بیگانہ سب ہیں تشنۂ خوں
کرے ہے موئے بدن کار نشترِ فصّاد

پڑی بلا پہ بلا اس قدر کہ آنکھوں ہیں
جہاں سیاہ ہے مانند کورِ مادر زاد

بہ تنگ ہو کے زمانہ کے ہاتھ سے ہر دم
نکلتی دل سے صدا ہے کہ یا علی فریاد

پھروں ہوں اُڑتا اِدھر کا اُدھر اُدھر کا اِدھر
بگرد و باد حوادث بسان کاغذ باد

حصار چرخ سے جاؤں نگر نکل کے کہاں
کہ گھیرے بیٹھے ہیں رستوں کو زادہ ہائے زیاد

کرم کی ہو نظر اے آفتابِ عز و شرف
کہ چھائی عالمِ ہستی میں ظلمتِ بیداد

پس اب تو ہو شبِ راحت نصیب جانِ حزیں
کہ میں بھی بیٹھ کے روشن کروں چراغ مراد

کمی ہے حضرتِ عالی ہیں کونسی شے کی
عطا ہوں مطلبِ دل حد آرزو سے زیاد

رجوع قلب سے سب مومنیں کہیں آمین
بحقِ احمدِ مرسل و آلہ الامجاد

نوطرزِ مرصّع

اقبال اک برس جو مرا تلج سر ہوا
شملہ پہ مجھ کو موسمِ سرما بسر ہوا

جاڑے کے مارے چلتے ہوئے پانی تھم گئے
اور جو تھمے ہوئے تھے وہ یخ ہو کے جم گئے

دامانِ کوہسار میں سورج بھی لیٹ کر
دبکا لحاف ابر میں مُنہ کو لپیٹ کر

دیکھو جو گھر تو سب در و دیوار تھے سفید
باہر چلو تو دامنِ کہسار تھے سفید

پتے تھے آ کے جاڑے نے سب دور کر دئے
اور تھے درخت برف نے بلّور کر دئے

اک رات بیٹھے بیٹھے جو میں تنگ آ گیا
گھر سے نکل کے آگے ٹہلتا چلا گیا

دیکھا کہ دوڑا جاتا ہے اک تازہ نوجواں
ہمت کے ہاتھ میں ہے اُٹھائے سپہ نشاں

ہے اُس پہ روشنی سے لکھا ہاں بڑھے چلو!

ہمت کا اس کی حال میں لکھکر سناؤں کیا
کاغذ کے کوزے میں کہو دریا کو لاؤں کیا
جاتا تھا نوجوان عجب آن بان سے
پیدا شکوہ و شان تھی اُس کے نشان سے
چلتا قدم اُٹھائے تھا اور سر جھکائے تھا
گویا خروش و جوش کو دل میں دبائے تھا
کیا جانے فکر مند تھا یا کیا ملال تھا
تیور بگڑ رہے تھے کچھ ایسا خیال تھا
سینے میں نعرہ بند تھا منہ میں نہ تھی صدا
لیکن خموشی اُس کی باآواز کرنا
دیتی تھی ہر قدم پہ صدا ہاں بڑھے چلو!

وہ آگے آگے جاتا تھا میں ساتھ ساتھ تھا
دامن تھا اُس کے شوق کا اور میرا ہاتھ تھا
جو آکے خود سیاہیٔ شب راہ پر پڑی
آبادی ایک شہر کی ہم کو نظر پڑی
خوشحال گھر اور اُن میں خوشی بولتی ہوئی
باتیں کہ غم سے دل کی گرہ کھولتی ہوئی
گھر گھر اُجالے تھے سر دیوار سامنے
دروازوں سے چراغ نمودار سامنے
تھے ہر طرف سے جاڑے کے ساماں پکارتے
تارے بھی اک کنارے سے تھے آنکھ مارتے
آرام کہہ رہا تھا کہ آگے نہ جا نہ جا
اور میں بھی کہہ رہا تھا کہ سچ سچ بجا بجا
سمجھانے والے سب یونہی سمجھا کے رہ گئے
اتنا بھی وہ نہ سمجھا کہ ہیں کیا یہ کہہ رہے
چپکے سے گر کہا تو کہا ہاں بڑھے چلو!

پھیرا تھا منہ ابھی نہ شب تیرہ فام نے
اک پیر مرد تجربہ کار آیا سامنے
پیری کی برف نے تھا اُسے تن بدن دیا
موئے سفید نے نمدی پیرہن دیا
بولا کہ اے جوان عجب کالی رات ہے
اور وقت وہ کہ رات ہے یا حق کی ذات ہے
سنسان جنگل اور یہ درختوں کی سائیں سائیں
چاروں طرف پہاڑ ہیں ہیں دوڑتی بلائیں
طوفان برف سر پہ کھڑا ہے تُلا ہوا
ہے یہ درہ کہ موت کا منہ ہے کھلا ہوا
مانا کہ لطف عیش و طرب پر نظر نہیں
جانا کہاں ہے جان کا بھی تجھ کو ڈر نہیں
یہ سُن کے نکلا شعلۂ دل نوجوان سے
گویا ستارہ ٹوٹ پڑا آسمان سے
اور اُس نے دی کڑک کے صدا ہاں بڑھے چلو!

تھی رات رنگ ابھی رخِ عالم پہ پھیرتی
گہ مشک اُڑاتی تھی گہے عنبر بکھیرتی

کیا جانے ہم نکل کے کدھر کے گئے
دیکھا کہ جاڑے زور سے اپنے اُتر گئے
موسم بھی معتدل ہے ہوا ہے لہک گئی
خوشبو کا ہے یہ حال کہ دُنیا مہک گئی
اور جانور ہیں رات کے آواز دے رہے
رل مل کے ساتھ جیسے ہوں وہ ساز دے رہے
پانی کی ہیں پہاڑ سے آوازیں آرہیں
جو زیر و بم کے دُور سے ہیں سُر ملا رہیں
ناگاہ آئی ایک پریزاد سامنے
کی رمزِ گل سے بلبلِ رنگیں کلام نے
جاتے ہو ایسے وقت میں کس کام کے لئے
آرام کیجے رات ہے آرام کے لئے
دیکھا پری کو اُس نے مگر چشمِ ناز سے
اور پاس ہو کے نکلا عجب سوز و ساز سے
پھر اتنا مسکرا کے کہا ہاں بڑھے چلو!

ناگہ فلک پہ دامنِ شب چاک ہو گیا
لبریز نور سے طبقِ خاک ہو گیا
مُنہ رات کا جو صبح کے آنے سے فق ہوا
گلگونہ لے کے سامنے رنگِ شفق ہوا
روئے سحر پہ شان تھی نور و ظہور کی
چاروں طرف وہ زمزمہ خوانی طیور کی
وہ گہری سبزیوں میں گلِ تر کی لالیاں
اور اوس سے بھری ہوئی پھولوں کی پیالیاں
وہ صبح کی ہوا سے درختوں کا جھومنا
اور جھوم جھوم کر وہ رُخِ گل کا چومنا
سبزی جو روئے خاک پہ مخمل بچھا گئی
شبنم بھی آ کے رات کو موتی لُٹا گئی
پانی وہ صاف صاف جو بل کھا کے جاتے تھے
پارے کے سانپ گھاس پہ لہرا کے جاتے تھے
سورج نے سر نکالا یکایک پہاڑ پر
بولا جوان شیر کی صورت دہاڑ کر
آرام کی نہیں ہے یہ جا ہاں بڑھے چلو!

تبدیل جبکہ دُھوپ سے رنگِ سحر ہوا
اک مدرسہ کے آگے سے اُس کا گزر ہوا
تھا پاس اک خرابۂ مسجد پڑا ہوا
مُلّا تھا اُس میں بر سرِ منبر چڑھا ہوا
تھا ہر طرف کو دامنِ تقریر کھینچتا
اور دوزخ و بہشت کی تصویر کھینچتا
حور و قصور پر تھا دلوں کو لبھا رہا
دوزخ دکھا کے خلقِ خدا کو ڈرا رہا
تھے لوگ اُس کی باتوں پہ مدہوش ہو رہے
اور معتقد تھے سب ہمہ تن گوش ہو رہے
دیکھا جو نوجوان کو اُس مردِ پیر نے
اپنی لکیر پیٹی پُرانے فقیر نے

یعنی کہ آؤ خلد کا نقشہ دکھائیں ہم
بیٹھو کہ تم کو عرش کے اُوپر اُڑائیں ہم
بولا جواں کہ اب وہ زمانے گزر گئے
وہ رات ہو چکی وہ فسانے گزر گئے

اور سب سے پھر اشارہ کیا ہاں بڑھے چلو!

ملکِ فنا اگرچہ بہت بے ثبات ہے
بے پاؤں بے مدار ہے جو اس کی بات ہے
لیکن بجا کہا جو کسی نے کہا ہے یہ
ہمت کے معرکوں کے لئے خوب جا ہے یہ
پر دیکھتا جو ہوں تو یہاں طرفہ حال ہے
مطلق ادھر نہیں کوئی کرتا خیال ہے
دن رات ہے امیروں کو آرام سے غرض
ساقی سے مدعا ہے و یا جام سے غرض
باقی فلک زدوں کا تو پھر کیا ٹھکانہ ہے
افلاس ان کے واسطے پہلا بہانہ ہے
اور جو کہ رکھتے ہمت و غیرت سے کام ہیں
محنت سے پیٹ پال رہے صبح و شام ہیں
لڑکے وظیفوں پر ہیں سبق یاد کر رہے
تنخواہوں پر ہیں محنتیں اُستاد کر رہے
پھرتے فقیر مانگتے در در ہیں صبح و شام
کہتے ہیں بار بار کہ دے جا خدا کے نام

آزاد کی یہی ہے صدا ہاں بڑھے چلو!

غزلیات

۱۸۶۵ء میں کہ خطۂ پنجاب میں **سر ڈانل میکلوڈ** صاحب کا مبارک عہد تھا۔ آزاد نے سریر آرائے سلطنت کی ہمدردی کا سہارا پایا۔ اور چند سخن شناسوں کے روبرو اس باب میں اپنے دلی خیالات ظاہر کئے۔ مگر اس سبب سے کہ اُسی اثنا میں اُنہیں سفر بلخ و بخارا پیش آگیا۔ یہ کوشش ادھوری اور ناکام رہی۔ ۱۸۶۷ء میں جبکہ وہ بہت سی سیر و سیاحت کر چکے تھے اور دُنیا کے تجربوں سے ذخیرے بھر چکے تھے اُنہوں نے اس آرزوے قدیمی کو جسے برسوں سے وہ سینے میں دبائے پھرتے تھے استقلال کے ساتھ ظاہر کرنا چاہا۔ چنانچہ ماہ اگست ۱۸۶۷ء

میں آزاد نے ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ ہر چند کہ غزل کہنے سے طبیعت بیزار ہو گئی تھی۔ مگر اُس پرانی ڈگر کو چھوڑنا اور چھڑوانا کوئی ہنسی کھیل نہ تھا۔ طبیعت جو شاعرانہ جوش سے بھری پڑی تھی اس کو ضبط کرنا بھی مشکل تھا۔

ذیل کی غزلیں مولٰینا آزاد مرحوم کے ایک بستہ میں سے نکلی تھیں۔ غالباً بیماری کی حالت کی تصنیف ہیں۔ اپنے مکرّم دوست شیخ عبدالقادر صاحب کی درخواست پر مخزن کے لئے میں نے دیدی تھیں۔ اب ان کو اس مجموعہ میں شامل کر دیتا ہوں۔

نظم آزاد پر مخزن ماہ نومبر سنہ ۱۹۰۱ء میں ریویو

کچھ عرصہ ہوا شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد دہلوی کے کلام منظوم کا ایک دلچسپ مجموعہ شائع ہوا تھا۔ جس کا عنوان یہ تھا۔ "نظم آزاد۔ جو قید حسن و عشق سے آزاد ہے"۔ مولوی آزاد نے جو رتبہ اردو زبان کے اعلٰی ترین مصنفوں میں پایا ہے محتاج بیان نہیں۔ خصوصاً نثر کے میدان میں تو وہ معاصرین سے گوئے سبقت لے گئے ہیں۔ نظم جدید رنگ میں کبھی کبھی کہتے تھے۔ اور طبیعت کی تیزی قید حسن و عشق سے نکل کر بھی اپنے جوہر دکھاتی تھی۔ اب ایک عرصے سے اُردو علم ادب کی بدقسمتی نے ملک کو اُن کی دماغی خدمت سے محروم کر دیا ہے۔ اور اُن کی مفید تالیفات و تصنیفات کا سلسلہ بند ہو گیا ہے۔ ان کی نثر موزوں کی اب صرف یاد باقی ہے۔ اور نظم آزاد کی فقط کہانی زبانوں پر ہے۔ جن لوگوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب پنجاب میں پہلے پہل تعلیم کا چرچا ہوا۔ اور لائٹنر صاحب مشہور جرمن علامہ نے دار الخلافہ پنجاب میں دار العلوم کی بنیاد ڈالی۔ اور اطراف و جوانب سے سخن داں اور سخن فہم لوگ جوہر سخن کی قدردانی دیکھ کر لاہور کی طرف جھکے۔ انہیں یاد ہو گا کہ جو مشاعرے انجمن پنجاب کے متعلق ڈاکٹر لائٹنر کی سرپرستی سے ہوتے تھے اور جن میں مشتاقان سخن بلا قید مذہب و ملت جوق جوق آتے تھے۔ اُن میں گلشن ذوق دہلوی کا یہ عندلیب کس انداز سے چہکتا تھا۔ فصاحت

اس کے کلام پر نثار ہوتی تھی۔ اور بلاغت اس کی طرز تحریر پر فدا تھی۔ دہلی کے علوم و فنون کے باغ پر جب غدر کی خزاں آئی اور کئی بڑے بڑے درخت جڑ سے اُکھڑ گئے۔ کئی پودے سوکھ گئے۔ کئی پھول کُملا گئے۔ اور کئی غنچے بن کھلے مُرجھا گئے۔ تو چند مرغانِ چمن نے اُس اُجڑے دیار سے کوچ کرکے خطۂ پنجاب کو آبسایا۔ گو اس ملک میں وہ گل بوٹے جو اُن کے مایۂ زندگی تھے اُنہیں نظر نہ آتے تھے۔ تاہم اُنہوں نے یہاں کی سرزمین کو سیراب اور مادۂ قبول سے بہرہ ور پایا۔ اور اُن کی دُعائے سحری کے اثر سے دنوں میں پنجاب بھی ایک ہرا بھرا گلزار ہوگیا۔ جس میں وہ آزادی سے نغمہ سنجی کرنے لگے۔ انہی خوش نواؤں میں آزاد بھی تھا۔ کئی اپنی اپنی بولیاں بول کر اُڑ گئے۔ مگر آزاد کو یہ باغ ایسا بھایا کہ اُسی کو اپنا نشیمن بنالیا۔ اور غربت کو جس میں امن نصیب ہو آفت زدہ وطن پر جہاں کسی نہ کسی وبال کا سامنا رہتا تھا ترجیح دیکر یہیں کا ہو رہا ؎

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالب
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

گو دہلی کو آزاد کی زاد بوم ہونے کا فخر ہے۔ اور دہلی کے اساتذہ کے زیرِ سایہ ہی آزاد نے تعلیم و تربیت پائی۔ مگر پنجاب سے بھی اُسے اب وہ گہرا تعلّق ہے کہ پنجاب کو بھی اُس کے وجود پر ناز کرنا بجا ہے۔ طوفان حوادث نے ہمارے طبّاع مصنّف کے لئے استاد شفیق کا کام دیا۔ اور تجربہ کے مدرسے میں اُس نے وہ وہ سبق سیکھے جو طبع رسا کے سمند ناز کے لئے تازیانہ بن گئے۔ ذوق جیسے اُستاد کی صحبت سنگ پارس کا حکم رکھتی تھی۔ اُس نے سونا کرکے کُٹھالی سے نکالا۔ مگر یونیورسٹی کی ملازمت میں مشرقی علوم کے قدردان انگریزوں کی صحبت سونے پر سہاگہ ہوگئی۔ سیر و سیاحت اور وسط ایشیا اور ایران کی مجالس نے اُس زرِ خالص کو ایسا چمکایا کہ اُردو علم ادب میں آزاد کا کلام کندن کی طرح دمکنے لگا۔ قصص ہند میں وہ سادی پُرکاری دکھائی ہے کہ سبحان اللہ۔ ہندی پڑھیں تو سب

مطالب سمجھ میں آجائیں۔ منتہی پڑھیں تو شیرینیٔ کلام کے چٹخارے لیں۔ نیرنگ خیال میں ایک یونانی طرز تحریر کا ایسا نمونہ اُڑا لیا ہے۔ کہ یونانی یاد کریں کہ اُڑانے والے رنگ یوں اُڑا لیتے ہیں۔ الیگوری انگریزی میں یونانیوں کی تقلید سے کسی زمانہ میں بکثرت مروّج رہی اور اب تک پسند کی جاتی ہے۔ اس میں بہت سے ضروری اور مفید مطالب کسی ایسے پیرایہ میں بیان کئے جاتے ہیں جس کا ربط اُن مطالب سے بظاہر نہ معلوم ہو۔ مشرقی علم ادب کے ذخیروں میں تو مذہبی کتب میں اس کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ اور مولینا روم فارسی لکھنے والوں میں اس طرز کے بادشاہ ہیں۔ مگر جو وسعت مغربی مصنفوں نے اس کو دی ہے اور جس حد تک انہوں نے استعاروں کو پھیلا کر طویل کہانیاں بنائی ہیں۔ اس کے نمونے ایشیائی تصنیفات میں کمیاب ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ہم اپنے ہاں اس کے لئے ایک لفظ تلاش کریں تو مشکل سے پائیں۔ ہاں یہ شعر اس کا مفہوم خوب ادا کرتا ہے ؎

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں	گفتہ آید در حدیث دیگراں

مگر اُردو میں نیرنگ خیال نہایت عمدہ اور نہایت کامیاب الیگوری ہے۔ آب حیات میں آزاد نے دریا کوزے میں بند کیا ہے۔ اور زبان اُردو کے استادوں کے کلام پر اپنے عبور اور اُن کے حالات کی نسبت اپنی واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ کتاب نہایت مقبول ہوئی ہے اور کئی دفعہ چھپ کر ہاتھوں ہاتھ بک چکی ہے۔ دربار اکبری کے نورتن اگرچہ آزاد کے زمانۂ علالت میں مولوی ممتاز علی صاحب کی کوشش سے چھپے ہیں۔ مگر انہیں آزاد نے دربار میں اپنی صحت کے دنوں میں اپنے ہاتھوں ہی سے بٹھایا تھا۔ دیوان ذوق جہاں تک مکمل دستیاب ہو سکا۔ مع تمہیدوں اور حواشی کے چھپوا کر ذوق کا حق اُستادی ادا کیا گیا ہے۔ اور جو چھوٹی چھوٹی درسی تالیفات آزاد کیا اردو اور کیا فارسی ملک بھر میں مروّج ہیں وہ ان کے علاوہ ہیں ؛

گو عارضۂ دماغی نے آزاد کے فیضان سے ملک کو محروم کر دیا۔ مگر یہ

اک طرفہ تماشہ ہے کہ مولینا کا کام کا عادی دماغ علالت میں بھی بیکار نہیں رہ سکا۔ اور اشہب قلم صفحۂ کاغذ پر برابر گھوڑ دوڑ کرتا رہا۔ اس دوڑ دھوپ کا ایک نتیجہ تو کتاب سپاک نماک ہے جو مطبع رفاہ عام لاہور نے ایک اعجوبہ کے طور پر چھاپی ہے تاکہ لوگ دیکھ سکیں کہ عالی دماغوں کی بیماری بھی دوسرے دماغوں کی بیماری سے کتنی مختلف ہوتی ہے۔ وہ کتاب کسی ایسے شخص کی لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ جو کسی نئے مذہب کا بانی ہونا چاہے۔ اور عجب نہیں اُن دنوں ایسے ہی خیالات مولینا کے دل میں جاگزین ہوں۔ دوسرا نتیجہ ان دنوں کی سرگرمی کا غزلیات ہیں۔ پُرانی مشق کی غزلیں جو کبھی کسی کو دکھاتے بھی نہ تھے آجکل نکال نکال کر پڑھتے ہیں۔ اور نئی غزلیں کہتے ہیں۔ علم قلب انسانی کے ماہر اس بات کو اچھی طرح سمجھ سکینگے۔ کہ علالت میں مولینا کی طبیعت نے مدت کے بعد غزل کی طرف کیوں رجوع کیا ہے۔ اس میں تو شک نہیں کہ ابتدائی عمر میں مولینا آزاد نے غزل گوئی میں خوب زور مارا ہوگا۔ گو جوانی میں ضروریات زمانہ کے احساس سے اپنی شاعری کا رنگ بدل دیا اور زیادہ پختہ کاری نے نثر کو ترقی دینے کی ضرورت سُجھائی۔ لیکن جب اس فکر سے فراغت ہوئی۔ کہ ضروریات زمانہ کیا چاہتی ہیں۔ پھر وہی پُرانا رنگ غالب آیا۔ آجکل غزل گوئی مقبول مشاغل میں ہے۔ اور یہ مزے کی بات ہے۔ کہ اس میں کسی دماغی عارضہ کا اثر نظر نہیں آتا۔ البتہ تصوف کا رنگ غالب ہے۔ غزلوں پر غزلیں لکھتے ہیں اور بے پروائی سے رکھ دیتے ہیں۔ مگر یہ پسند نہیں کرتے کہ کوئی ان کو لے جائے یا چھپوائے۔ چونکہ ہم ان لوگوں میں ہیں جو ان کے ہر قسم کے کلام کے ہر وقت مشتاق رہتے ہیں۔ اور ہمیں بہت سے احباب کا بھی حال معلوم ہے۔ جو مولینا کے کلام کو نہایت شوق اور ادب کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس لئے ہم نے یہ گستاخانہ کوشش کی ہے۔ کہ ہم مولینا کی غزلیات کچھ نئی کچھ پرانی اپنے ناظرین کے لئے حاصل کریں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ دست شوق کی یہ گستاخی

مولینا بھی قابل معافی سمجھینگے اور کبھی کبھی شائقین کو اپنے کلام سے مستفید ہونے کا موقع دینگے۔ ہمارے مہربان آغا محمد ابراہیم صاحب جو مولینا کے فرزند رشید ہیں۔ ان غزلوں کے بہم پہنچانے کے لئے خاص شکریہ کے مستحق ہیں۔

غزلیات

اس دلِ پُر داغ سا گلشن میں اک لالہ تو ہو
پر یہ گل جیسا ہے کوئی دیکھنے والا تو ہو

آفریں ہمت کو اُسکے دل کی جس نے عشق میں
جان تک پیاری نہ کی ایسا جگر والا تو ہو

ہم تو قیس و کوہکن کے بھی تماشے دیں بھُلا
لیلی و شیریں سا کوئی دیکھنے والا تو ہو

ایک ہی ساغر میں کچھ ایسا پلادے ساقیا
بے خبر دُنیا و دیں سے تیرا متوالا تو ہو

ہاتھ خالی مردمِ دیدہ بتوں سے کیا ملیں
موتیوں کی پنجۂ مژگاں میں اک مالا تو ہو

ناخنِ خار آکے خود عقدہ ترا کردے گا وا
پہلے پائے شوق میں پیدا کوئی چھالا تو ہو

کچھ نہ کچھ آزاد کو بھی چاہیئے دلبستگی
گر نہ ہو بتخانۂ چیں سبز بنگالہ تو ہو

مثالِ ابر کرم فیض عام کرتے ہیں
وہی ہیں خوب کہ جو خوب کام کرتے ہیں

نہ کیونکہ اہل کرم ہوویں کامیاب جہاں
کہ ہیں یہ کام جو کرتے وہ کام کرتے ہیں

ہزاروں قافلے حسرت کے دشت غربت میں
ہمارے خانۂ دل میں مقام کرتے ہیں

دلوں میں کرتے جو الفت سے ہیں جہانداری
جہاں کو ایک نظر میں غلام کرتے ہیں

ہیں اہل دل ابھی زندہ کہ ذکر خیر اُن کے
دلوں سے آکے سلام و پیام کرتے ہیں

دکھا کے سبزۂ جنت کے باغِ سبز آزاد
غزالِ نفس رمیدہ کو رام کرتے ہیں

اُس رُخ کا دھیان اے دل دیوانہ چاہیئے
اس شیشہ کو بنانا پریخانہ چاہیئے

عاشق کو جینے جی کبھی شکوہ نہ چاہیئے
لب تک جو آئے آہ تو مرجانا چاہیئے

دل میں خیال زلف چلیپا نہ چاہیئے
کعبہ میں ذکر دیر و کلیسا نہ چاہیئے

جو کچھ کہ جی ہے چاہتا روشن خدا پہ ہے
پر وہ صنم جو چاہے ہے تو پھر کیا نہ چاہیئے

دل خانۂ خدا تھا دلے ہو گیا خراب
اس گھر کو اب بنانا صنم خانہ چاہیئے

مانا کہ دلبروں کا ستم بھی ہے دلبری
پر اپنے بیدلوں سے تو ایسا نہ چاہیئے

جانوں سے تنگ آ گئے دلدادگانِ عشق
اتنا بھی ظلم اے ستم آرا نہ چاہیئے

دیوانگانِ عشق کو زیبا ہے داغِ سر
شاہوں کے سر پہ افسرِ شاہانہ چاہیئے

چاہے جو تو کہ دل میں کرے اہلِ دل کے گھر
دلدارئِ یگانہ و بیگانہ چاہیئے

اے غافلو کبھی تو اُدھر کی بھی لو خبر
ایسی بھی دل میں اُلفتِ دُنیا نہ چاہیئے

جس جا ملے جگہ وہیں سر رکھ کے مر رہے
بستر پہ خاکساروں کو تکیہ نہ چاہیئے

کیا بیٹھا جمع کرتا ہے سامانِ عمرِ نوح
بحرِ جہاں میں دم کا بھروسا نہ چاہیئے

دامانِ ناخدا ہے اگر ہاتھ میں تو پھر
تنکے کا ڈوبتے کو سہارا نہ چاہیئے

آزاد بے ثباتئِ دُنیا کو دیکھکر
یہ چاہتا ہے دل کہ کچھ اصلا نہ چاہیئے

غیرِ دیدارِ صنم گر ہو سروکار مجھے
تو میسر نہ ہو اللہ کا دیدار مجھے

تیری اُلفت نے کیا جینے سے بیزار مجھے
جان سے کھوتا ہے پیارے یہ ترا پیار مجھے

دیتے کیا ہیں دلاسے شبِ فرقت میں بہم
دل بیمار کو میں اور دلِ بیمار مجھے

حق خدمت میں ملے دیکھئے کیا حضرت دل
کہ ہے قسمت سے ملی عشق کی سرکار مجھے

دیکھنا قیدِ تعلق میں نہ آنا آزاد
دام آتے ہیں نظر سبحہ و زنار مجھے

بیٹھی بے فکر یہ کیا خلقِ خدا ہنستی ہے
جس کے یوں ہنسنے پہ رو رو کے قضا ہنستی ہے

اس پہ مرتا ہوں کہ جوہر سے تری تیغ کی آب
مار کر آنکھ سوئے آبِ بقا ہنستی ہے

شمع تو روتی ہے اور صبح کا پیغام لئے
رات بھر سر پہ کھڑی بادِ صبا ہنستی ہے

آج تک کچھ نہ کھلا رازِ بہار و شبنم
شب وہ کیا روتی ہے اور صبح یہ کیا ہنستی ہے

شمع نے خاک ہی جب کر دیا پروانے کو
جانئے اب اس کی بلا روتی ہے یا ہنستی ہے

رولے اے دلِ غم سرور میں کہ جو آنکھ یہاں
آج رو لیتی ہے واں جا کے سدا ہنستی ہے

کوئی گل پھولیگا پھر باغ جہاں میں آزاد
آسماں پر جو شفق صبح و مسا ہنستی ہے

ہے کہاں سے تو نے یہ طرز ستم ایجاد کی
دھوم ہے بیداد گر ہر سو تری بیداد کی

پوچھنا حالت ہے کیا میرے دلِ ناشاد کی
آہ کی حالت نہیں طاقت نہیں فریاد کی

بل بے سوز دل کہ ہے بدلے لہو کی بوند کے
آبلہ آتا زباں پر نشترِ فصاد کی

شکل اسکندر نہیں آتی کسی صورت نظر
دیدۂ حیرت ہے آنکھ آئینۂ فولاد کی

تشنۂ الفت کا تیرے کیا کہیں سوز دروں
پڑ گئے کانٹے زباں پر خنجرِ جلاد کی

آبداری کے لئے محتاج خاکستر ہوا
مفت آئینہ نے اپنی آبرو برباد کی

قیدیانِ زلف پر کیا جانے شب کیونکر کٹی
آج زنداں سے نہیں آتی صدا فریاد کی

روزِ قتلِ عاشقِ ناشاد ہے شادی کا دن
دھوم جائے شور ماتم ہے مبارکباد کی

آپڑا تھا آستاں پر تیری ہو کر خاک میں
پر صبا نے اور بھی مٹی یہاں برباد کی

سرو ساں زنجیرِ الفت سے ہے پابندِ چمن
نام کو آزاد ہے حالت ہے یہ آزاد کی

جلوہ گر سامنے گر وہ مہِ کامل ہوتا
مہر کا منہ تھا کہ اس رخ کے مقابل ہوتا

دل نے اس زلف کے سودے میں ہے پھر ڈالا ہاتھ
دیکھو دیوانہ ہے خود پا بہ سلاسل ہوتا

برق کو دیکھ کے یاد آتی ہے جب تیغ نگاہ
ہائے بیتاب ہے کیا کیا دلِ بسمل ہوتا

کیا تماشہ تھا کہ صحرائے جنوں میں مجنوں
پردۂ چشم ترا پردۂ محمل ہوتا

جس کو یاں نقص سمجھتے ہیں وہی واں ہے کمال
یاں جو ناقص ہے وہ ہی عشق میں کامل ہوتا

چشم گریاں مری ہوتی نہ کبھی بے ساماں
دامنِ وحشت نہ تھا دامنِ ساحل ہوتا

وصل اس کا نہیں ہوتا تو نہ ہوئے لیکن
دست امید تو گردن میں حمائل ہوتا

دیکھتا آئینۂ دل میں جو یوسف یہ جمال
محو حیرت ترا اے حور شمائل ہوتا

بادشاہانِ جہاں جس کی غلامی چاہیں

کیوں تو آزاد اُسی سے نہیں سائل ہوتا

کیا طلسم طرفہ تر ہیں دیدۂ تر باندھتے
ہیں گرہ میں اشک ترکی آبِ اخگر باندھتے

شعلۂ جوّالہ کر دیتے ہیں مہر و ماہ کو
زیر گردوں شعلۂ دل جب ہیں چکر باندھتے

مرد دریا دل ہیں جو رکھتے ہیں جاری بحر فیض
وہ گرہ در دل نہیں مانند گوہر باندھتے

سب ہیں حیراں دیکھ شیشہ میں شراب آتشیں
آب و آتش کو ہیں یکجا یعنی کیونکر باندھتے

کھول بیٹھا دل مشقت ہائے دُنیا سے کمر
ہم بھی اب سنگِ قناعت ہیں شکم پر باندھتے

ابر دریا بار کیے ہیں دم میں اُڑ جاتے دھوئیں
ہیں جھڑی تھم کر گرا پے دیدۂ تر باندھتے

واعظانِ بدعمل جام و سبو کو توڑ کر
کیوں عبث ہیں مظلمہ کا بوجھ سر پر باندھتے

ابر باراں شرم سے ہوتا ہے کیا کیا آب آب
تار ہیں رونے کا جس دم دیدۂ تر باندھتے

طائرانِ دل سدا جن کے ہیں اس قد پر نثار
آشیاں ہیں وہ سرِ شاخِ صنوبر باندھتے

نافۂ مشکیں کا بخیہ دیکھنا کھل جائے گا
ہیں گرہ وہ بھی سرِ زلف معنبر باندھتے

حیف آتا ہے کہ کھوئی عمر مضموں باندھ باندھ
ایسی بندش سے تو بہتر تھا کہ چھپر باندھتے

بندشِ الفاظ میں جو آ گیا سو بندھ گیا
اور کیا آزاد اس میں خاک پتھر باندھتے

سمجھتے مصحفِ رُخ کو ترے ایمان کتنے ہیں
نظر خواں اس میں کتنے حافظ قرآن کتنے ہیں

تجھے اے آئینہ رو دیکھ کر حیران کتنے ہیں
بہت سے دیتے ہیں دل اور دیتے جان کتنے ہیں

نہیں اک دم کی گنجائش حوادث گاہ دنیا میں
اور اس پر بے سر و ساماں کئے ساماں کتنے ہیں

مرا سینہ بھی کم گنج شہیداں سے نہیں قاتل
شہید اس میں ترے ہاتھوں ہوئے ارمان کتنے ہیں

پری رویوں پہ دینی جان اور پھر وہم دانائی
کہوں کیا حضرت دل آپ بھی نادان کتنے ہیں

میں وہ سینہ سپر ہوں منہ نہ موڑوں تیر باراں سے
تری ترکش میں صید افگن بھلا پیکان کتنے ہیں

نہ کر روز جزا کا فکر اے آزاد تو دل میں
جو رحمت اُسکی برحق ہے تو یہ عصیان کتنے ہیں

مئے گل رنگ جو تو پی کے مری جاں نکلا
اور بھی رنگ ترا اے گلِ خنداں نکلا

آگیا موسم گل عیش کا ساماں نکلا
رنگ چمکا کے چمن میں گل خنداں نکلا

پائے قاتل کا بیاں کیا کروں میں یمن قدوم
کہ جہاں رکھا قدم گنج شہیداں نکلا

کچھ عجب کوچہ ہے اُس یار مسیحا دم کا
آیا جو درد لئے لے کے وہ درماں نکلا

آہ دل نالہ نے قلقل مے۔ بانگ جرس
نکلا جو درد سے ظالم تڑبے نالاں نکلا

مرض عشق نے کی جان کی مشکل آساں
درد سمجھے تھے جسے ہم وہ ہی درماں نکلا

کیا صبا پھونک گئی کان میں اے بلبل راز
ہے شگوفہ سے جو ہنستا گل خنداں نکلا

چمن دہر سے نکلا نہ کوئی خوش ہو کر
آیا گل باغ میں خنداں پہ پریشاں نکلا

مردم دیدہ نے سمجھا تھا اسے طفل سرشک
پر یہ لڑکا تو کوئی تودۂ طوفاں نکلا

جذبۂ دل کا ہوں قائل کہ مرے سینہ سے
دل نکل آیا نہ پر تیر کا پیکاں نکلا

عقدۂ دل ہوا وا جنبش ابرو سے تری
سمجھے جس کام کو مشکل تھے وہ آساں نکلا

آج تک کہتا تھا عالم جسے مجموعۂ دل
یہ تو سیپارہ بھی اوراق پریشاں نکلا

دم بخود رہ گئے مرغان چمن گلشن میں
لیکن آزاد ادھر ہو کے غزل خواں نکلا

سمجھتے جس کو تھے ہم یار مہرباں اپنا
غضب ہے آج وہی ہے وبال جاں اپنا

کھلے جو دیدۂ غفلت تو یہ ہوا روشن
کہ نفع جسکو تھے سمجھے وہ تھا زیاں اپنا

پھرے ہے وادیٔ غفلت میں دیکھتا کیا تو
نشاں جو ڈھونڈئے اُس کا مٹا نشاں اپنا

ہمارے دل کی تو دلدار تک ہے دلداری
جو وہ نہ دل کو سنبھالے تو دل کہاں اپنا

جو تیغ ناز کی فکر اب کریں تو غیر کریں
کہ ہم تو دے چکے پہلے ہی امتحاں اپنا

میں ضبط دل کا ہوں قائل کہ خون ہو کے بہا
پہ حرف شکوہ نہ لایا سر زباں اپنا

جو نالوں سے مرے دل کے تہ و بالا جہاں ہوتا
تو پھر نیچے زمیں ہوتی نہ اوپر آسماں ہوتا

بلا سے دشمن جانی مرا سارا جہاں ہوتا
کسی صورت سے اے جان جہاں تو جان جاں ہوتا

بغل میں گل کے بلبل شاخ گل پر آشیاں ہوتا
جو ہوتا دوست گلچیں یار اپنا باغباں ہوتا

تماشا جاں نثاری کا تو جب تھا دید کے قابل
کہ بیجاں نیچے سے تیرے تیرا نیم جاں ہوتا

یقیں ہے گر دل نالاں مرا اک جا مکیں ہوتا
تو جس جا ہے مکاں ہوتا وہاں پر لامکاں ہوتا

تمہارے بیدلوں کی خاک اگر صرف چمن ہوتی
تو ہر اک شاخ گل پر جائے غنچہ گل عیاں ہوتا

جو کوئی چوٹ دل کی ساتھ تیشہ کے اثر کرتی
تو جائے آب ہر چشمہ سے شیریں خوں رواں ہوتا

دلِ نالاں جرس کی طرح آجاتا ہے جنبش میں
رواں سینہ سے جب ہے آنسوؤں کا رواں ہوتا

جو محنت گاہ دنیا میں نہ ہوتی موت کی فرصت
تو غافل صرف آسائش نہ یاں ہوتا نہ واں ہوتا

صنم ہے گردش عالم نگاہ مہر سے تیری
اگر تو مہرباں ہوتا تو عالم مہرباں ہوتا؟

خدا کے واسطے آزاد روکو نالۂ دل کو
کہ کوئی آن میں کون و مکاں ہے لامکاں ہوتا

ہم تو تمہارے در پہ پڑے رات بھر رہے
کیا جانے آج رات کو تم کس کے گھر رہے

ہم تو خیال یار کے گھر ہجر میں رہے
اپنی کہو کہ حضرت دل تم کدھر رہے

ہم بیکسوں کا زور اگر ہے تو بس یہ ہے
جب جی سے تنگ آئے تو رو رو کے مر رہے

ہیں خانہ ہائے چشم جو خالی پڑے ہوئے
یوں اس میں آسما۔ کہ نہ جائیے نظر رہے

سمجھے تھے تیرے در کو ٹھکانا دل خراب
تو در سے دے اٹھا تو یہ بے گھر کدھر رہے

مستِ شراب ناز ہے اپنے نشہ میں آپ
کس کی خبر وہ لے۔ جو نہ اپنی خبر رہے

جو مرغ رکھتے تھے پر پرواز اڑ گئے
اُن کا خدا ہے اب کہ جو بے بال و پر رہے

اغیار کیا کہ یار بھی سب ہو گئے اُدھر
اب دل کی دیکھئے یہ دوانہ کدھر رہے

یارب یہ برق ہے کہ دلِ بیقرار ہے
ظالم زمیں پہ ٹھہرے نہ افلاک پر رہے

ملک خودی میں دیکھتے ہیں سیر بیخودی
آزاد ہم وطن میں بھی کرتے سفر رہے

جو چشم دل سے ہم نے اے بتِ کافر ادا دیکھا
نقاب رخ میں تیرے جلوۂ نور خدا دیکھا

جو بت خانہ میں بیٹھے ہم۔ تو جلوہ یار کا دیکھا
کوئی پوچھے۔ خدا کے گھر میں زاہد تو نے کیا دیکھا

نہ کیونکر عقدہ ہائے دل ہوں وا اُن سے کہ ہم نے تو
فقط اُن کی بدولت جلوۂ مشکلکشا دیکھا

ڈریں کیا شور محشر سے کہ ہم نے بارہا زاہد — خرامِ یار سے ہنگامۂ محشر بپا دیکھا
ہزاروں چرخ کھائے۔ آسمانِ پیر نے لیکن — نہ ہمسا با وفا دیکھا۔ نہ تجھ سا بے وفا دیکھا
بہت دیر و حرم کی سیر کی پر اے بت کافر — کہیں تجھکو نہ پایا اور تجھکو جابجا دیکھا
قلم کاری مژہ کی دیکھی۔ اور آنکھوں کی گلکاری — کتابِ عشق میں کیا کیا نہ قسمت کا لکھا دیکھا
نہ دیکھا تو نے ہم کو اور ہم نے تیرے جلووں میں — خدائی کا تماشا اے بُت کافر ادا دیکھا
جو مُنہ دُھو دھو وضو کرتے تھے سب سینہ سیہ نکلے — سیہ رویونکا سینہ شکل آئینہ صفا دیکھا
نہ آیا ایک بھی نکتہ سمجھ میں حرفِ مطلب کا — کتابِ عشق کو از ابتدا تا انتہا دیکھا
گئے تم غیر کے گھر بھی تو کچھ شکوہ نہیں ہم کو — وہیں ہم مٹ گئے جس جا تمہارا نقش پا دیکھا
نہ دیکھا بھول کر تو نے مری جانب تغافل سے — ہزاروں مرتبہ ہم نے تری محفل میں آ دیکھا
زمیں تو اک طرف ہے چھان ماری نہ سمندر کی — مگر دریائے اُلفت کا نہ کوئی آشنا دیکھا
نہ نکلا قول فیصل اختلافِ رند و زاہد میں — کہ جو سمجھا وہ در پردہ۔ وہ اس نے برملا دیکھا
نہ کیونکر آسماں پر ہو دماغ ان خاکساروں کا — کہ اپنی ابتدا کو انتہائے کیمیا دیکھا
عجب آب و ہوا ہے اُس مسیحا دم کے کوچے کی — کہ جس کو درد یاں پایا اُسی کو واں دوا دیکھا
ٹپکتا ہے جو خوں ہو ہو کے دل ہر پتی پتی سے — نگاہِ ناز سے کس شوخ نے سوئے حنا دیکھا

فقط خونِ جگر پر اب تو آٹھیرا گزارہ ہے
میاں آزاد کچھ اس عشق بازی کا مزا دیکھا

لے لے کے مزے کھائیں نہ ہم کیونکہ بھلا دال — ہے گوشت سے آزادوں کو سو درجہ سوا دال
ازبس ہے زمانہ میں صدا دل کو بدل راہ — یہ دال پہ قربان ہے اور اس پہ فدا دال
ہوتی نہیں یہ گریۂ خوانِ کس و ناکس — بے گوشت ہی خوش رہتے ہیں اور لیتے ہیں کھا دال
ہیں نعمتِ الوان سے سمجھتے اسے۔ بہتر — آرام سے گھر بیٹھے اگر دیوے خدا دال
بل بے تری آداب کہ عالم میں ہمیشہ — ہے تاج سر بیضۂ عنقا و ہما دال
بچپن کی جو ہے چاٹ تو پیری کا سہارا — ہے دال کی خوبی پہ ولا اس کی وفا دال
ہے دال کی گر چاہ دلوں پر شفقتِ مادر — تو روٹیوں کو پالتی ہے مثل دوا دال

غربت میں بھی کرتی نہیں منعم سے کنارہ — جو حق رفاقت ہے سو کرتی ہے ادا دال
خوانِ امرا کا ہے اگر گوشت مصاحب — ہے کاسۂ غربت میں انیس الغربا دال
ازبس سگِ دنیا ہیں بہت گوشت پہ گرتے — ہے اس لئے مرغوب نہیں انکو سوا دال
نقصاں کے سوا ہوگا نہ کچھ گوشت سے حاصل — غافل ہے یہی خوب کہ کھا اور کھلا دال
ہے گوشت میں تاثیر فقط حرص و ہوا کی — اور اسکو جو دیکھو ہے فرشتوں کی غذا دال
قربان شکم تجھکو جو ہونا ہے تو کھا گوشت — اور دفع ضرورت جو ہو مطلوب تو کھا دال
ہے نام میں بھی گوشت کے آثارِ ثقالت — اور اس کا لقب دیکھو کہ ہے دال شفا دال
یہ دال شفا مقتبس خاک شفا ہے — سومن ہے سوا وہ ہی جسے بھاوے سوا دال
خوش ہو ہو کے کیا گوشت کے چرتا ہے نوالے — ایسا نہ ہو ہو جاوے کہیں تجھ سے خفا دال
یہ گوشت تو چولھے میں گیا پہنچے یہ نوبت — اتنا نہ رہے کھائے جو ٹکڑے سے لگا دال
کیوں زاغ و زغن گوشت پہ ماریں نہ جھپٹے — مردار کا ہو جن کو مزا کھائیں وہ کیا دال

آزاد ابھی ہو جاتے ہیں شاگرد ہم اُس کے
کاغذ کے پتیلے میں جو یوں دیوے پکا دال

بزم میں ذکر مرا لب پہ وہ لائے تو سہی — وہیں معلوم کروں ہونٹھ ہلائے تو سہی
سنگ پر سنگ ہر اک کوچہ میں کھائے تو سہی — پھر بلا سے ترا دیوانہ کہلائے تو سہی
گو جنازہ پہ نہیں قبر پہ آئے وہ مری — شکوہ کیا کیجے غنیمت ہے کہ آئے تو سہی
کیونکہ دیوار پہ چڑھ جاؤں کوئی کہتا ہے — پاؤں کا ٹونگا انگوٹھے کو جمائے تو سہی
پارۂ مصحفِ دل نظے ترے کوچہ میں پڑے — آنے پاؤں کے تلے شکر کہ پائے تو سہی
صاف بے پردہ نہیں ہوتا وہ غرفہ میں نہ ہو — روزنِ در سے کہیں آنکھ لڑائے تو سہی
گہ بڑھاتا ہے گہے مہ کو گھٹاتا ہے فلک — پر شب ہجر کو ہم دیکھیں گھٹائے تو سہی
ایک نالہ سے کروں حشر میں برپا سو حشر — شور محشر مجھے سوتے سے جگائے تو سہی
شب یلدا ابھی ہو جائیگی کافور سحر — زلف مشکیں کو وہ چہرے سے اُٹھائے تو سہی
میرا نالہ جو زمیں سے ہوا ابھی رو بہ فلک — ہے یقیں چرخ کو اک بار ہلائے تو سہی

تھے تمہیں نکلے جو اس دامِ بلا سے آزاد
ورنہ تھے پیچ میں اس زلف کے آئے تو سہی

طلوع اوج پہ ہے آج اخترِ مینا | کہ دستِ ساقیٔ مہوش ہے افسرِ مینا
اگر کہوں تری گردن کو ہمسرِ مینا | تو زیرِ سنگ مرا سر ہو اور سرِ مینا
کہو یہ اہلِ نظر سے کہ آنکھیں کھولیں ذرا | کھلینگے آج سرِ بزم جوہرِ مینا
صبا سے غنچۂ خاطر کھلیگا کیا ساقی | گرہ تو دل کی کھلے جب کھلے سرِ مینا
مجھے یہ ڈر ہے پری بن کے اڑ نہ جائے کہیں | کہ موجِ بادۂ مینا ہے شہپرِ مینا
چراغِ حسن پہ ساقی کے ہیں یہ پروانے | کہ گرتی آن کے مینا ہیں بر سرِ مینا
حباب دیکھ کے شیشہ میں مست حیراں ہیں | اُتارا کیونکہ ہے مینا میں ساغرِ مینا
قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں جام دے ساقی | کہ تیرے سر پہ مرا خوں ہے یا سرِ مینا
تم اپنے آئینۂ رخ پہ دیکھو خط کی نمود | اگر نہ دیکھا ہو مینا میں جوہرِ مینا
جو میکشی کا مزہ ہے تو میکشو یہ ہے | کہ پائے خم پہ دھرا سر ہو ہاتھ پر مینا

نہ سنگِ حادثۂ محتسب سے ڈر آزاد
شمولِ ہمتِ مرداں ہے یاورِ مینا

شب آ کے بزم میں ساقی جو بے نقاب ہوا | چمک کے جامِ مئے ناب آفتاب ہوا
پسینہ عارضِ گلرنگ کا گلاب ہوا | پڑا جو زلف کا سایہ تو مشکِ آب ہوا
نصیب خنجرِ قاتل سے دل کو آب ہوا | مگر جواب لبِ لعل سے جواب ہوا
تمہارا مصرعِ قامت تو انتخابی تھا | ہمارا نالۂ موزوں بھی لاجواب ہوا
ہوا معاملۂ دل کا فقط نگاہ پہ طے | نہ کچھ حساب ہوا اور نہ کچھ کتاب ہوا
تھا آیا اہلِ خرابات کے سنوارنے کو | پر آ کے بزم میں زاہد بہت خراب ہوا
دلِ تپیدہ کی میں نے تڑپ جو دکھلائی | تو مرغِ بسمل اسے دیکھ کر کباب ہوا
وہاں تو شیشۂ مے توڑا یاں دلِ رنداں | کوئی یہ پوچھے کہ زاہد کو کیا ثواب ہوا
ہے دستِ ساقیٔ مہوش سے میکشی کا مزہ | کہ ماہتاب میں روشن ہے آفتاب ہوا

ہوا خمار پس از توبہ زندگی کا وبال — ثواب سمجھے تھے جسکو وہی عذاب ہوا
شہِ جنوں کا جو دربارِ بے تعلّق ہے
ہمارے واسطے آزاد ہے خطاب ہوا

کیا غضب ہیں تری اے ترک جفاکار آنکھیں — دو ہی کر دیتی ہیں ہوجاتی ہیں جب چار آنکھیں
ہم نہ کہتے تھے کہ کھو دیگا دلِ زار آنکھیں — یاں تلک رویا کہ آخر ہوئیں بیکار آنکھیں
اپنے ہاتھوں سے نکالونگا میں اے یار آنکھیں — اب نظر بھر کے جو دیکھیں تو گنہگار آنکھیں
چشمِ کافر میں نشہ کے جو ہیں ڈورے ساقی — کیا بھلی لگتی ہیں پہنے ہوئے زنّار آنکھیں
آمد آمد ہے یہ کس یوسف مصری کی آج — سر بازار بچھائے ہیں خریدار آنکھیں
بند ہوجائیگی پھر مملکتِ دل کی خبر — کہدو توڑیں نہ کہیں آنسوؤں کا تار آنکھیں
رُخ رنگیں کی جو ہوں یاد میں خونبار آنکھیں — میرے دامن کو کریں دامن گلزار آنکھیں
دیں جو تلخابۂ غم مجھکو تو ہے عین کرم — دیتی ہیں ورنہ کسے شربتِ دیدار آنکھیں
طوطے کی طرح سے دل لیکے بدل جاتے ہیں آنکھ — کیا ہی عیار ہیں رکھتے بُتِ عیار آنکھیں
چشمِ نرگس کو بھی گلشن میں بڑے دعوے ہیں — تم ذرا چل کے دکھا دو سرِ گلزار آنکھیں
نہیں کرتے جو مسیحائی ہماری نہ کرو — پر تم اپنی تو خبر لو کہ ہیں بیمار آنکھیں
تم ذرا برق نگہ کا جو اشارہ کردو — گھر کے ہوجائیں ابھی ابرِ گہربار آنکھیں
دل اُڑانا ترا اور ان کا مکر جانا صاف — کرتی آنکھوں میں ہیں گھر کیا تری عیار آنکھیں
دخترِ رز رہے جو بے طرح تو بے طرح سہی — تاک بیٹھیگی کوئی اور طرحدار آنکھیں
آبرسیو کبھی او حسن کے نیساں یہاں بھی — مدتوں سے ہیں کھلی تشنۂ دیدار آنکھیں
کوئی اُس سامری عصر سے جاکر یہ کہو — کہ ترے نرگسِ جادو کی ہیں بیمار آنکھیں
درّۃ التاج ہیں تو ان کو لگا لے شہ حسن — دیکھ تو لائی ہیں کیا کیا درِ شہوار آنکھیں
آنکھ کی خوش نظری ہے کہ ہو تو نورِ نظر — جب نظر ہی نہیں ان میں تو ہیں بیکار آنکھیں
سچ ہے اک جا پہ بہم کیونکہ رہیں دو بیمار — مرا بیمار ہے دل ان کی ہیں بیمار آنکھیں
جام سرشار سے اس بزم کو کردے سرشار — تو بھی سرشار ہے ساقی تری سرشار آنکھیں

خوں ٹپکتا ہے پڑا تیغ نگہ سے تیری
کیا ہی خونریز ہیں ظالم تری خونخوار آنکھیں

آپ کی میری سرِ بزم لڑائی ہو گی
جا کے غیروں میں لڑایا نہ کرو یار آنکھیں

دیکھے کس طرح سے کوئی تجھے اے پردہ نشیں
کہ دکھاتی ہیں تری روزنِ دیوار آنکھیں

ہائے حسرت نہ بر آئی کبھی دل کی آزاد
ساتھ ہی لے کے چلیں حسرتِ دیدار آنکھیں

لایا ہے رنگ آب رخِ بوستاں نیا
گلشن نیا ہے باغ نیا باغباں نیا

مدت کے بعد آئی جو گلشن میں ہے بہار
فیضِ ہوا سے پھر ہوا باغِ جہاں نیا

گردوں شفق سے سرخ و زمیں گل سے لالہ گوں
گویا کہ ہو گیا ہے زمیں آسماں نیا

دامانِ کوہسار میں لوٹے ہے آب جو
ہے بہرِ تیغِ موج یہ سنگ فساں نیا

گردوں پہ کہکشاں ہے عجب چاندنی کی بیل
اک اک ستارہ جس میں گلِ بے خزاں نیا

اور اس میں بدر سے بسرِ چرخ سبزہ رنگ
اک چاندنی کا پھول ہے کھلتا یہاں نیا

رخ سے جو ہے الٹ دیا دامانِ ابر تر
نکلا نکھر کے رنگ رخِ آسماں نیا

ریشِ شعاعِ مہ پہ کرے شام کو خضاب
بنتا ہے چرخ پیر بھی ہر شب جواں نیا

آیا قشون لالہ اڑاتا ہوا نشاں
بدلے نہ کیونکہ رنگ شکستِ خزاں نیا

بلبل نہ کیوں اڑائے ترانے نئے نئے
نسریں نیا سمن ہے نیا ضیمراں نیا

داغِ دلِ فسردہ بھی جوں لالہ کھل پڑے
مدت میں پھر ہوا ہے یہ اجڑا مکاں نیا

ہوتا ہے سبز دل سے نکلتے ہی نخل آہ
ہے گلشنِ ہوا میں یہ سروِ رواں نیا

فیضِ بہار و ریزشِ ابرِ بہار سے
بحرِ جہاں ہوا ہے کراں تا کراں نیا

عمرت دراز باد کہ لایا تو ساقیا
بھر شراب کہنہ خم بیکراں نیا

ہووے نہ تجھ سا خسروِ گردوں نشاں نیا
سو بار ہو اگر سرِ گردوں جہاں نیا

دن ہجر و وصل یار کے ڈھلتے چلے گئے
دنیا کے رنگ تھے کہ بدلتے چلے گئے

کل وہ حنا جو ہاتھوں میں ملتے چلے گئے
خوں ہو کے دل سبھوں کے پگھلتے چلے گئے

وہ ناز سے جدھر کو نکلتے چلے گئے
دل بیدلوں کے تھے کہ کچلتے چلے گئے

مثلِ غبار قافلہ واماندہ رہ گئے
ہمراہی اپنے چلتے ہی چلتے چلے گئے

یہ دستِ آرزو نہ ہوے اس گلے کا ہار
حسرت سے ہاتھ ہم یونہیں ملتے چلے گئے

راہِ فروتنی ہے وہ کوچہ کہ خاکسار
جتنے گرے یہاں وہ سنبھلتے چلے گئے

لکھنے جو بیٹھے وصفِ لبِ لعلِ یار ہم
گویا دہن سے لعل اُگلتے چلے گئے

وحشی تمہاری جنبشِ مژگاں کے دھیان میں
دیوارِ قہقہا تک اچھلتے چلے گئے

طفلِ سرشک آنکھوں سے دامن تلک تو آئے
لیکن قدم قدم پہ مچلتے چلے گئے

برباد کر کے کشتیِ گردوں کو جوں حباب
یہ چشمہ ہائے چشم اُبلتے چلے گئے

دل کے شرار آہ سے جوں ناوکِ شہاب
انگارے آسماں تک اُچھلتے چلے گئے

ہے طرفہ ماجرا کہ رُکے جتنا سب سے وہ
اُتنے ہی دل سبھوں کے پھسلتے چلے گئے

حلوائے تر کی طرح سے بیمار غم ترے
لختِ دل و جگر کو نگلتے چلے گئے

ہم سے تو قول تیرا نہ پورا ہوا کبھی
وعدوں کے دن سدا یونہیں ٹلتے چلے گئے

ہر دم پھرے ہے ساتھ نسیم و صبا لگی
ایسی چمن میں آ کے گلوں کو ہوا لگی

اس گل سے جا لگی کبھی اُس گل سے جا لگی
گلشن میں ہے کسی نہ کسی سے صبا لگی

دل پر مرے لگا کے سنانِ نگہ وہ شوخ
کہتا ہے اے لو پھینکی کدھر کس کے جا لگی

کیا گرم نالہ ہو کہ دلِ داغدار پر
ہے مہر ہو کے وہ نگہِ سرمہ سا لگی

اللہ رے جانِ خوں شدہ کا شوقِ پائے بوس
رنگِ حنا ہو یار کے قدموں سے جا لگی

اے چشمِ اشکبار خبر جلد لیجیو
اب تو ہے دل کی آگ جگر کو بھی جا لگی

یہ ہم ہی تھے بچا گئے جو اس نگہ کا وار
تیغِ قضا وگرنہ بھلا چھوڑتی کیا لگی

ہوتا ہے رشک سے دلِ خوں گشتہ آب آب
دیکھے ہے جب ترے کفِ پا میں حنا لگی

چھوڑے ہے جیتے جی کوئی اس زلف کا خیال
بے ڈھب ہے دل کے پیچھے یہ کالی بلا لگی

تم خوب غیر خوب بُرے ہیں اگر تو ہم
تم کو ہماری بات بھلی کب بھلا لگی

سینہ میں سوز غم سے جگر یوں بھڑک اُٹھا / اس گھر سے آگ جیسے ہو اُس گھر کو جا لگی
دیوانہ پن سے میرے وہ گھبرا کے بولے رات / یارب یہ میرے پیچھے کہاں کی بلا لگی
گھٹوا کے شب جو آئے صفاچٹ ہو شیخ جی / سر پہ ہے اک چٹاخ سے آتے ہی کیا لگی
گھورے ہے ایک ایک کو آنکھیں نکال کر / نرگس کو بھی چمن میں یہ آکر ہوا لگی

آزاد یہ بھی موج حوادث کا ہے سلوک
کشتیٔ عمر ورنہ کنارہ بھی جا لگی

مئے لعلیں ہے یہ ساقی نے بھری شیشہ میں / یا اُتر آئی ہوا سے ہے پری شیشہ میں
کرتا ہے توبۂ زاہد کے لئے کار تفنگ / کیا غضب سحر کی دارو ہے بھری شیشہ میں
دیکھ تل لب پہ ترے سمجھے ہم اے آئینہ رو / لب شیریں نے بھری تل شکری شیشہ میں
باندھے ہے تیغ و سپر موج و حباب مئے ناب / گرم ہے معرکۂ کینہ وری شیشہ میں
وائے تقدیر کہ کس وقت مراد ور آیا / جب کہ باقی رہی ساقی نہ ترے شیشہ میں
دل دیوانہ پہ کب چلتا ہے گنڈا تعویذ / کہ یہ جن اُترے ہے مشکل سے ڈری شیشہ میں
ساقیا ظلم ہے یہ فصل بہار اور اُس میں / شیشہ ہو طاق پہ اور مے ہو بھری شیشہ میں
پھرتی ہے آنکھوں میں اے رشک پری چال تری / آشیانگیر ہوا کبک دری شیشہ میں
محتسب بہر خدا دست ستم کر کوتاہ / ہو نہ قلقل کے عوض نوحہ گری شیشہ میں
معجز حسن سے ساقی کے عجب کیا ہے اگر / شاخ موج مئے لعلیں ہو ہری شیشہ میں

کیوں نہ ہوں اہل نظر محو تماشا آزاد
دختر رز کی ہوئی جلوہ گری شیشہ میں

شاخ گل تک جو ذرا بار ہے پاتی بلبل / پھولوں جامہ میں نہیں اپنے سماتی بلبل
ہے تو باغ میں خالی نہیں پاتی بلبل / اور صبا گل سے ہے گلچھرے اُڑاتی بلبل
ہے یہ افسانۂ غم کس کو سناتی بلبل / دھوم سے فصل بہار آکے ہے آتی بلبل
لوٹتی پھرتی ہے مستی میں کدھر باد صبا / کہ مزے گل کے ہے گلشن میں اُڑاتی بلبل
نہیں جا سکتی چمن میں تو صدا ہی اپنی / پس دیوار سے ہے گل کو سناتی بلبل

لوٹتا سبزۂ بیگانہ پہ ہنس ہنس کے ہے گل — دیکھ پلٹے تو ابھی زہر ہے کھاتی بلبل
کیسۂ غنچہ جو رکھتی ہے گرہ میں تو صبا — زرِ گل مفت چمن میں ہے لٹاتی بلبل
مست ہیں سارے جوانانِ چمن اور گل کے — ہے مزے تاک کی اوجھل میں اُڑاتی بلبل
بہکی بہکی سی جو بکتی ہے دوانوں کی طرح — تو ہے کیا کیا گلِ خنداں کو ہنساتی بلبل
چھوڑ دے صحنِ چمن ہیں کہ بس اب ہے صیاد — کوئی دم اور ہوا باغ کی کھاتی بلبل
دیتی گلبرگِ چمن کو نہیں جنبش ہر دم — چٹکیوں میں ہے صبا تجھکو اُڑاتی بلبل
اب تو ان نالوں سے گل کا بھی بھر آئے ہے جی — گئے وہ دن کہ تھی روتوں کو ہنساتی بلبل

آئے یوں گلشنِ بزمِ شعرا میں آزاد
صبحدم جیسے کہ گلزار میں آتی بلبل

شب نشہ میں جو رخِ یار سے پردہ اُٹھا — لطفِ دورِ شبِ مہتاب ہے کیا کیا اُٹھا
بسترِ مرگ سے میں ہو کے نہ اچھا اُٹھا — تا دمِ آخر مرے بالیں سے مسیحا اُٹھا
غلغلہ جبکہ تری فتنہ گری کا اُٹھا — فتنۂ حشر بھی اک مرتبہ چلا اُٹھا
حرم و دیر میں ہے شورِ قیامت یارب — رُخ سے یہ کس بُتِ بیباک کے پردا اُٹھا
بل بے آہِ شرر انگیز تری شعلہ زنی — شعلہ نارِ سقر دیکھ کے تھرا اُٹھا
وہ قدم تو بھی تو دے ساتھ کہ ہے کارِ ثواب — آج ظالم ترے کشتہ کا جنازہ اُٹھا
شمع بھی دیتی ہے گل ہو کے دُھواں پر اے وائے — جل بجھا جب تو دھواں بھی نہ ذرا سا اُٹھا
نہ کریں مر کے بھی ہم رازِ محبت اِفشا — تھا وہ منصور ہی کم ظرف جو چلا اُٹھا
بل بے وحشت کہ ترے خاک نشینوں کا غبار — یا تو آندھی ہوئی یا ہو کے بگولا اُٹھا
آفتاب اپنی حرارت پہ بہت نازاں تھا — پر مرا داغِ جگر دیکھا تو تھرا اُٹھا
بے خبر تو بھی تو شامل ہو ذرا ماتم میں — آج دُنیا سے ترا عاشقِ شیدا اُٹھا
خلق سے اُٹھ گئے پر سنگِ درِ جاناں سے — روشِ نقشِ قدم پاؤں نہ اپنا اُٹھا
بل بے جذبِ دلِ مجنوں کہ سوئے نجد آکر — پھر نہ ہرگز قدمِ ناقۂ لیلےٰ اُٹھا
بکا بازارِ محبت میں نگہ پر دلِ زار — جنس سودا زدہ کا مول تو اچھا اُٹھا

اللہ اللہ رے وحشت کہ سوئے آبادی
نہ غبار اپنا کبھی ہو کے بگولا اُٹھا

حسرت اُس تشنۂ قسمت کی ہے ناکامی پر
دور ساغر میں جو ہو بیٹھ کے پیاسا اُٹھا

جل گئے سوزِ نہاں سے جگر و دل شاید
دیکھنا روزنِ سینہ سے دھواں سا اُٹھا

راست رو آ کے ہوئے کج روشوں میں ناکام
بے ثمر سرو ہے گر باغ میں سیدھا اُٹھا

تم نشہ میں رہے بر بسترِ گل اور یہاں
دل کی بیتابی سے سو بار میں بیٹھا اُٹھا

نالہ و آہ گئے عرش سے اوپر لیکن
روشِ اشک ندامت نہ سر اپنا اُٹھا

شعر گوئی کا تو دعوےٰ نہیں رکھتا آزاد
ہاں پر اُستاد کی خدمت میں ہے بیٹھا اُٹھا

لختِ جگر ہیں یوں مژہ تر کی نوک میں
قطرہ ہو خوں کا جیسے کہ نشتر کی نوک میں

اس سرو قد کے عارضِ گلگوں کو دیکھنا
کیا گل کھلا ہے شاخِ صنوبر کی نوک میں

فصّاد سوزِ عشق سے میرے ہے کیا عجب
پڑ جائے آبلہ ترے نشتر کی نوک میں

گرتے ستارے رات کو ہیں دیکھ دیکھ کر
قطرے عرق کے زلفِ معنبر کی نوک میں

اس مہروش کے تار نظر پر ہے آفتاب
جوں مہ شعاع مہرِ منور کی نوک میں

مضمون سوزِ دل سے جگر ہو وہیں کباب
باندھوں جو نامہ بالِ کبوتر کی نوک میں

ناز و ادا سے تیری ستمگر ہیں جان و دل
خنجر کی نوک میں کبھی نشتر کی نوک میں

بالیدہ نخلِ عشق سے ہے یوں جنوں کی شاخ
جوں نکلے شاخِ تر شجرِ تر کی نوک میں

ہو کیا مزہ کہ گوہرِ انجم پروئیے
تارِ شعاعی کو مہِ انور کی نوک میں

دکھلاتے لاکھ تیزیاں پر پیشِ چشمِ یار
یہ کاوشیں کہاں کسی نشتر کی نوک میں

کس کس مزہ سے چاٹتا ہے ہونٹ زخمِ دل
قاتل ہے کیا مزہ ترے خنجر کی نوک میں

بل بے گدازِ عشق کہ خوں ہو کے آگیا
پیکانِ یار بھی مژۂ تر کی نوک میں

اللہ رے تیر یار گیا کس قدر ہے صاف
خونِ جگر کا نام نہیں پر کی نوک میں

جو ہیں آزاد اُنہیں چاہیئے ہے کیا تعویذ
وہ فقط نام علی سمجھے ہیں چلتا تعویذ

ہاتھ آجائے کسی ڈھب سے جو تصویر اُس کی
تو بنا رکھوں اُسے اپنے گلے کا تعویذ

حلقۂ زلف سیہ رکھتے ہیں طوق گردن
پھر بھلا کس کی بلا ڈھونڈھے ہے گنڈا تعویذ

دل ہے پر داغ تو گل سینہ پہ کیوں کھائیں ہم
پہنے جوشن ہیں تو پھر چاہیئے ہے کیا تعویذ

دل سیپارہ کو میرے نہ جلاؤ دیکھو
اس کو چھاتی سے لگا لو ہے گلے کا تعویذ

طفل اشک آنکھ سے ٹپکا کہ ہوا سینہ پہ داغ
ہے گلے کا ہوا بے طرح یہ لڑکا تعویذ

زلف شبرنگ کا سایہ وہ بلا ہے جس پر
نہ چلے سحر نہ منتر نہ فتیلا تعویذ

بہ تاب رخ سے تری پر ضیا ہے آئینہ
کہ بہر نام سکندر جلا ہے آئینہ

بہ فیض عام ترے لعل آبدار کا ہے
کہ رشک چشمۂ آب بقا ہے آئینہ

تھا جام بہر جم و آئینہ سکندر کا
یہ کیا ہی حق نے تجھے بھی دیا ہے آئینہ

کر اپنے آئینۂ دل میں سیر ہر دو جہاں
جہاں میں اس سے سوا اور کیا ہے آئینہ

صفائی روے مصفّا سے ترے عالم میں
جلائے خاطر اہل صفا ہے آئینہ

ہوئی رسائی ترے ہاتھ تک اسے حاصل
کمال صاحب بخت رسا ہے آئینہ

ضیاے عکس رخ تابدار سے تیری
مدام رکھتا دل پر صفا ہے آئینہ

نہ کیونکہ گردش جوہر ہو گردش گرداب
کہ تیرے جلوۂ رخ پر فدا ہے آئینہ

یہ تاب روے جہانتاب ہے کہ جس سے صدا
مثال مہر فلک پُر ضیا ہے آئینہ

یہ عین جوہر اخلاص ہے کہ دیتا سدا
ضیاے رخ کو ترے دل میں جا ہے آئینہ

یہ مہر رخ کا ترے فیض ہے کہ پیش نظر
ہمیشہ رکھتا ہر اک مہ لقا ہے آئینہ

دلِ مکدّرِ آزاد بھی صفائی میں
خیال مدح سے تیرے سدا ہے آئینہ

عکس رخ سے ترے لے لے کے ضیا آئینہ
دیتا ہے نام سکندر کو جلا آئینہ

ہو صفائیِ رخ روشن جو نہ شامل تو کبھی
نہ رکھیں پیش نظر اہل صفا آئینہ

جام تھا بہر جم آئینہ پئے اسکندر
پر دیا تجھکو بھی خالق نے ہے کیا آئینہ

دل ترا رشک جم و غیرت اسکندر رہے — اور کیا اس سے سوا ہوگا بھلا آئینہ
رہتا ہر دم ہے شب و روز ترے پیش نظر — واہ رکھتا ہے عجب بخت رسا آئینہ
گردش جوہر آئینہ سمجھ اس کو نہ تو — ہوتا ہر پھر کے ہے یہ تجھ پہ فدا آئینہ
ہے زبس جلوہ گہ نور خدا دل تیرا — عکس کو دیتا ہے دل میں ترے جا آئینہ
لعل تر دیکھ کے آئینہ میں ہو گرم سخن — ہووے تا چشمۂ صد آب بقا آئینہ
یعنی زور آور ذی مرتبہ زور آور سنگھ — سنگ کو ٹکڑے کرے جس کا سدا آئینہ
رائے بلدیو سنگھ اس کا خلف روشن بخت — نور سے جس کے سدا ہووے ضیا آئینہ

دل کو یاں گرد طمع سے ہیں سدا رکھتے صاف
رکھتے آزاد نہیں اہل صفا آئینہ

ہمارے سوز نہاں سے ہو گر عیاں آتش — زبان شعلہ پکارے کہ الاماں آتش
شرار آہ سے دل کی بھڑک اٹھا گردوں — کہاں سے جا کے لگی دیکھنا کہاں آتش
دکھائی آہ شرر بار نے جو گلکاری — مکاں مکاں ہوا گلخن جہاں جہاں آتش
لبوں تک آئے بھلا خاک حرف سوز جگر — کہ سینہ گلخن و دل اخگر و زباں آتش
یہ کیسے تفتہ دلوں کا ہے قافلہ یارب — کہ جلے گرد اڑاتا ہے کارواں آتش
پڑے ہیں دیر مغاں سرد چل دل سوزاں — برائے پیر مغاں لے کے ارمغاں آتش
بچی جو حسن بتاں سے وہ آئی دل میں مرے — بھلا ہوا نہ گئی بارے رائگاں آتش
چمک رہی ہے یہ کس نوجواں کی گرمی حسن — کہ خاک ہو گیا زر تشت و ہے جواں آتش
ہٹا دو عارض روشن سے کاکل مشکیں — کہ درد سر ہے اگر دے ذرا دھواں آتش
یہ اسکے عارض تاباں کا ایک تھا جلوہ — کہ شیخ شمع حرم سمجھا اور مغاں آتش
دکھا دو چیر کے سینہ ہمارا سوز دروں — کہ ہووے رشک سے انگاروں پر تپاں آتش
نہ کیونکہ طائر دل کے کباب ہوں نمکیں — کہ لعل لب ہے نمک پاش و رنگ پاں آتش
کھڑے ہیں بتکدہ حیرت میں عالم تصویر — کہ ہوتی کیونکہ ہے آب رخ بتاں آتش
نہ کیوں ہو جان و جگر سے ہمیں عزیز سوا — بتوں کے حسن سراپا ہماری جاں آتش

ہماری آہ کے شعلے ہوئے جو سر بہ فلک
تو شور ہو گیا برپا لگی کہاں آتش

کبھی تو سیر مرے لالہ زار دل کی کرو
کہ روز گل ہے کھلاتی نیا یہاں آتش

کہے ہے بلبلِ شوریدہ سر حکایتِ گل
ہمارے دل کی سنو گر تو داستاں آتش

مزا ہے سوزِ دروں کا جبھی کہ موسیقار
نکالے ہر سرِ مو بر سرِ زباں آتش

گیا جو نجد سے کرتا ہوا حدی خوانی
لگا گیا دلِ مجنوں میں سارباں آتش

کہے ہے بلبلِ دل تفتہ کیا کروں یارب
نہ گل کو چھوڑے ہے گلچیں نہ آشیاں آتش

ہوئے جو مر کے اُس آتش پری کے عشق میں خاک
تو اُن کے گور پہ کھینچے ہے سائباں آتش

ذرا تو آہِ شرر دم کو ضبط کر اے دل
جلا نہ دے کہیں یہ سقفِ آشیاں آتش

طپش سے عشق کے پہنچے فلک پہ ہم جوں برق
گئی ہے لیکے کہاں تک کشاں کشاں آتش

جلا پتنگ تو بولی یہ رو کے شمع لگن
کسی کی جاں ہے کسی کی بلائے جاں آتش

زبانہ زن ہے شب و روز کعبۂ دل میں
خدا کے گھر سے لگی ہونے بد زباں آتش

غضب ہے تشنۂ قسمت پہ دشتِ غربت میں
بجائے آب ہے برساتا آسماں آتش

اگر یہ ہو خبر اُس ابرِ رحمتِ حق کو
تو پھر بتا دوں ابھی ہیں گئی کہاں آتش

وہ کون یعنی حسین ابن ساقیِ کوثر
کہ جس کے قہر سے مانگے سدا اماں آتش

گرے جو برقِ غضب اُس کی مثلِ قہرِ خدا
تو قعرِ بحر میں پھر جا کے ہو نہاں آتش

وہ یوں ہے نورِ الٰہی سے ملصق و منضم
کہ جیسے ہووے حرارت سے تواماں آتش

دلا نکلتا نہیں مدحِ غائبانہ سے کام
کہ عرضِ حال میں حائل ہے درمیاں آتش

حضورِ قلب سے حاضر ہو آکے خدمت میں
کہ تا نہ پھر تجھے پہنچا سکے زیاں آتش

سُنا وہ مدحتِ حاضر میں کوئی مطلعِ گرم
کہ جس کو دیکھ کے لرزاں ہو شعلہ ساں آتش

مطلع ثانی

کرے جو قہر ترا کفر پر عیاں آتش
زبانِ شعلہ سے دینے لگے اذاں آتش

شہنشہا ترا سیمرغِ تیغ کھولے جو پر
تو باندھے بیضۂ ماہی میں آشیاں آتش

ہوائے نار و غا اُس کے آگے خاک ہو گرم
کہ آب سرد کا رکھتی ہے حکم واں آتش

ہے اُس کے آب میں اس طرح موجِ آتشِ برق
کہ جیسے پیرے ہے پانی کے درمیاں آتش

وہ نارِ حرب کرے مشتعل بدشتِ قتال
کہ جسکو دیکھ کے اُڑ جاے ہو دھواں آتش

شہا جو گرم عناں ہووے ذوالجناح ترا
مجال کیا ہے جو ہو اُس سے ہمعناں آتش

وہ رشکِ کبکِ دری ہوتا جب ہے گرم خرام
تو ٹھوکروں میں پھرے ہے رواں دواں آتش

شہنشا ترا نیزہ ہے یا کہ تیرِ شہاب
سنانِ نیزہ ہے یا مار در دہاں آتش

نکل کے جاے عدو کیا کہ گھیر لے اُس کو
بسانِ شعلۂ جوالہ درمیاں آتش

جو تیرِ حادثہ کی قطع اصل چاہے ہے شہا
جلا کے خاک کرے خانۂ کماں آتش

خدا کے واسطے جلدی بجھاؤ یا مولٰے
کہ لگ گئی ہے جہاں میں جہاں تہاں آتش

یہ دل میں آگ لگی ہے کہ سوزِ سینہ سے
لبوں پہ ہے عوضِ نالہ و فغاں آتش

جو ہے یہ نارِ بلا اور یہی ہے بادِ سموم
تو بحر و بر میں نہ دیگی کہیں اماں آتش

عجب نہیں ہے کہ مانندِ دودِ آہِ یتیم
اُڑا دے حضرتِ آدم کا دودماں آتش

دکھاؤ معجزۂ عیسوی براے خدا
ہوئی ہے بندوں کی شاہا عدوے جاں آتش

بناے خانۂ دل تا گرا دے سر تا سر
چڑھا کے لائی ہے دریاے بیکراں آتش

یہ تیرے ابرِ کرم پر نظر ہے یا مولٰے
ہزار ہووے زمیں آتش و زماں آتش

لگے جو آگ بھی دل میں تو مُنہ سے نکلے نہ آہ
زگالِ خام ہے دیوے اگر دھواں آتش

ہم اُن سے دُور بظاہر ہزار بیٹھے ہیں
پہ لاکھ جان سے دل میں نثار بیٹھے ہیں

جہازِ عمرِ رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوارِ خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

جو سنگِ در پہ ترے سایہ وار بیٹھے ہیں
وہ لاتِ دولتِ دُنیا پہ مار بیٹھے ہیں

ہے اُنکی خاک بھی چکر میں گرد باد کی طرح
جو انجمن میں تری ایک بار بیٹھے ہیں

ادھر بھی چشمِ عنایات ہو ذرا ساقی
کہ مستِ دیر سے اُمیدوار بیٹھے ہیں

چمن میں اُلجھے ہوئے ہیں جو دامنِ گل سے
وہ دل میں بلبلِ شیدا کے خار بیٹھے ہیں

ترے شہید ہیں بے غسل وغش پڑے سوتے
کہ جو وبال تھا سر سے اُتار بیٹھے ہیں

جلا کے ہجر میں تم نے جو خاک کر دیا دل
ہم اس کا داغ لئے یادگار بیٹھے ہیں

کمالِ عشق تو یہ ہے کہ جو بظاہر حال — بگاڑ بیٹھے ہیں یاں وہ سنوار بیٹھے ہیں
نگاہِ ناز کا ساقی کے ایک ہے یہ کمال — کہ بزم ہو گئی مدہوش۔ یار بیٹھے ہیں
جو واں ہیں نرگس جادو تو دل کو ڈر کیا ہے — کہ یاں بھی زلف کا باندھے حصار بیٹھے ہیں
کمان ابروئے جاناں کے ایسے ہوں قرباں — کہ جتنے تیر ہیں سینے کے پار بیٹھے ہیں
وہ صاف ہوئینگے کیا اپنے خاکساروں سے — کہ آپ دل پہ یہ بن کر غبار بیٹھے ہیں
تمہاری زلف کو تھے باندھتے پریشاں ہم — سو دامن آج لئے تار تار بیٹھے ہیں
نظر اُٹھا کے نہیں دیکھتا وہ صید افگن — دلوں کو ہاتھوں پہ رکھے شکار بیٹھے ہیں
اُڑی جو خاک دلِ سوختہ کی وحشت میں — سمیٹے اس کا یہ مشتِ غبار بیٹھے ہیں
فلک کی فتنہ گری کیا ہے سیکڑوں ایسے — خرامِ یار سے اُٹھ کر غبار بیٹھے ہیں
گئے وہ غیر کے گھر اُٹھ کھڑے ہو حضرتِ دل — اب آپ کس کا کئے انتظار بیٹھے ہیں
عمامہ شیخ پہ چھوڑینگے کیا بھلا وہ رند — جو اپنی پگڑی کو پہلے اُتار بیٹھے ہیں

قمار عشق میں اب کیا لگائینگے **آزاد**
کہ نقد دل کو تو پہلے ہی ہار بیٹھے ہیں

دُنیا ہے جب فنا تو فنا ہی سمجھ اسے — پی جام مرگ و آب بقا ہی سمجھ اسے
جو کچھ یہاں لیا ہے وہ رہیگا سب یہیں — پھر لیوے یا نہ لیوے لیا ہی سمجھ اسے
جو کچھ فلک کے نیچے ہے سب گرد باد ہے — پھر جو ہوس ہو دل میں ہوا ہی سمجھ اسے
مہماں سرائے دہر ہو جب منزلِ فنا — پھر جو محل سرا ہے سرا ہی سمجھ اسے
ہے ہر شفا کا جب مرض الموت ختم کار — پھر دے رضا قضا پہ شفا ہی سمجھ اسے
بزمِ فنا میں کچھ نہیں جز نغمۂ فنا — جو کچھ نہیں سنا ہے سنا ہی سمجھ اسے

آزاد نے قدم نہ رکھا قید حرص میں
سچ ہے کہ دی خدا نے ہے کیا ہی سمجھ اسے

ہمارے نام سے اُن کو اگر ہے عار تو کیا — جو اپنے نام سے لیں یار انہیں پکار تو کیا
کلام دل میں ہے اور دل کے درد میں بلبل — ہزار گل جو چمن میں ہیں دل فگار تو کیا

قرار برکفِ آزادگاں نگیرد مال
ہمارا صحنِ دل اور ہے خیال اُس گُل کا
گھرے فلک کی ہیں گردش میں دیکھئے کیا ہو
فلک کا دَور ہے اُس مہ جبیں کی صحبت میں
خدا سنوارتا ہے بیکسوں کی بگڑی کو

جو ایک پلٹے تو کیا اور اُڑے ہزار تو کیا
چمن میں آئی تو کیا اور گئی بہار تو کیا
کوئی گھڑی کو جو یاں ہو گیا قرار تو کیا
وہاں چڑھایا تو کیا اور دیا اُتار تو کیا
کسی کا کام کسی نے دیا سنوار تو کیا

ہم آپ صورتِ حیرت ہیں آئینہ دیکھو
قرار دل کو نہیں۔ ہے ہمیں قرار تو کیا

کہاں تھی بزم کہ واں یہ نہ دلفگار آیا
چمن میں کہتے ہیں پھر موسمِ بہار آیا
الٰہی خیر ہو زنداں میں خاکسار کی آج
صنم نہ دیر میں تو بولا اور نہ کعبہ میں
سر اپنا کاٹ کے پھینک آیا کوئے قاتل میں

تم آئے واں مجھے یاں حیف بار بار آیا
کوئی تو یہ بھی زباں سے کہو کہ یار آیا
ہوا کے گھوڑے پہ ہے محتسب سوار آیا
کہاں کہاں ترا شیدا تجھے پکار آیا
یہ بوجھ تھا مری گردن پہ سو اُتار آیا

جوان معرکۂ حسن و عشق تھا آزاد
چلا نہ دل پہ جو قابو تو جان ہار آیا

میرے سینے میں تری آہوں کے پیکاں رہ گئے
صبح کس رفتار سے آئے تھے تم گلزار سے
اپنے رتبے کو گھٹا کر بھی پھرے اہلِ کمال
حسن لب ہے ہے تبسم کہہ رہا دیکھو ادھر

کچھ تو آہوں میں گئے کچھ ہو کے پیکاں رہ گئے
جس روش پر تھے وہیں سرو خراماں رہ گئے
پھر بھی کچھ قیمت نہ پائی ہو کے ارزاں رہ گئے
ہو گئے روپوش موتی لعل و مرجاں رہ گئے

شمع رو سب دیکھتے تھے حسن کے شعلہ کو رات
ہم نے آئینہ دکھایا جب تو حیراں رہ گئے

جدھر کو ہم ہوئے آخر اُدھر کو تم نہ ہوئے
جو اہلِ علم تھے آئے حجابِ اکبر میں
اُٹھایا بارِ کتب خوب شیخ صاحب نے

ہم اپنے دل میں رہے ہائے کاش گم نہ ہوئے
بھلے کو حضرتِ دل دامِ ظلکم نہ ہوئے
پر اک تو دُم نہ ہوئی ایک یہ کہ سم نہ ہوئے

تمہاری جنبش لب کر گئی مسیحائی — ہزار شکر کہ ہم شرمسار قم نہ ہوئے

جہاں تھا معرکہ عشق شیخ بھاگے وہاں
پھر آکے سامنے کہنا کہ نوک دُم نہ ہوئے

رُخ سے اُلٹا جو نقاب اُس نے ذرا آن کی آن — خاک میں مِل گئی سب مہر درخشاں کی شان
کونسا گل نہیں گلشن میں کہ اے بادِ صبا — آج سُنتے نہیں ہم مرغ گلستاں کی تان

دورِ رندانِ خرابات ہیں آجا آزاد
تیغ عقل آن کے یاں چڑھتی ہے لسانکی سان

سنیگا دیکھنا رو رو کے آواز اک جہاں میری — تمہارے عشق کی ہے داستاں اور یہ زباں میری
سُناؤں داستانِ عشق قلقل کے پردہ میں — صراحی کے دہن پر کاٹ کر رکھدو زباں میری

تقاضا ہے گریباں کا کہ مجھ کو چاک کر ڈالو
تمنّا ہے یہ دامن کی اُڑا دو دھجیاں میری

دیکھنا ہے دمبدم گردش کو کیا افلاک کی — پیکر خاکی کو دیکھ اپنے گھڑی ہے خاک کی
تیر جو آیا سو اُترا خاک تودہ پر مرے — تھی چڑھی کس ہاتھ سے یارب کماں افلاک کی

قصائد

قصیدہ دُعائیہ بحضور سی بیڈن صاحب بہادر سکرٹر اعظم جناب فرمانفرمای کشور ہند

جہان فضل و ہنر قدر دان اہل کمال — جناب صاحب والا مقام سی بیڈن
جو فیض عدل سے ہو آپکے جہاں شاداب — تو غیرت گل گلشن ہو اخگرِ گلخن
وہ عقل آپ کی ہے جس سے کرتے کسب کمال — بسان طفل دبستاں ہیں عاقلانِ زمن
کروں شگفتگی طبع کا جو وصف تو ہو — زمین شعر شگفتہ ابھی برنگ چمن
جہاں ہے نیر اقبال آپ کا طالع — ہے نور مہر وہاں مثل مردہ شمع لگن

سُہیل دستِ سخاوت جو آپ کا چمکے
شمیمِ خلق پہ کھاتے ہیں پیچ و تاب مدام
بنائے ہمتِ عالی کی دیکھکر رفعت
تو ہوا دیم زمیں رشکِ صد ادیم یمن
وہ تیغ آپکی ہے رشکِ جوہرِ الماس
بسانِ طرۂ دلدار آہوانِ ختن
ہو خوش غلاف وہ جس دم میانِ دشت وغا
زمیں کی سمت ہے جھکتا قصرِ چرخِ کہن
وہ نیزہ آپ کا خارا شگاف و خفتاں دوز
ہو آب دیکھ کے جوہر کو جس کے دُرِّ عدن
اگر کریں سرِ میدانِ حضور اُسے جولاں
کفن میں ڈر سے تہمتن کا تھر تھرادے تن
سمند آپ کا گردوں شکوہ و کبک خرام
کہ جس کے نام سے لرزاں ہو دشمنوں کا بدن
چمک کے ہے دمِ مہمیز ایسا کرتا جست
تو جھڑ پڑے وہیں سورج کی چرخ پر سے کرن
اب اس دُعا پہ ہے **آزاد** مختصر کرتا
جو چابکی میں پری ہے تو نازکی میں سمن
جہاں کو تا کہ ہو اہلِ جہاں سے زینت و زیں
دہانِ یار سے برجستہ جیسے نکلے سخن
گراں نہ خاطرِ نازک پہ گزرے طول سخن
زمیں کو تا کہ ہو رونق بہ فیضِ اہلِ زمن

مدام رہویں زمانہ میں دوست آپکے شاد
ہمیشہ رہویں مصیبت میں مُبتلا دشمن

قصیدہ

کس جستجو میں کھاتا ہے یاں چکر آسماں
دن رات ٹھیرتا جو نہیں دم بھر آسماں
رکھتا ہے دن کو عینکِ خورشید آنکھ پر
پھرتا ہے شب کو مشعلِ مہ لیکر آسماں
سرگرم سیر دن کو ہے گر مہر در بدر
کھولے ہے شب کو دیدۂ ہر اختر آسماں
اللہ رے جستجو کہ ہے شبہائے تار میں
پھرتا عصائے کاہکشاں لے کر آسماں
حیراں تھا دل میں اپنے یہی میں کہ رات دن
دیوانہ وار پھرتا ہے کیوں در در آسماں
کیا ایسی جستجو ہے کہ دن بھر تمام رات
کچھ ڈھونڈتا پھرے ہے جھکائے سر آسماں
روئے زمیں کے گرد سحر سے ہے تا بہ شام
جھپکاتا آنکھ شب کو نہیں پل بھر آسماں
یاں تک ہے بلکہ گرم تگاپو کہ پاؤں میں
رکھتا ہے جائے آبلہ صد اختر آسماں

پوچھا جو میں نے پیر خرد سے کہ کیا سبب
کھاتا ہے چرخ گرد زمیں مثل گرد باد
بولا تجھے خبر نہیں اس کی کہ کس لئے
اُس آستاں کے شوق میں پھرتا ہے یہ مدام
اس آرزو میں پھرتا ہے دن رات دربدر
دُنیا کی خاک اُڑائی مگر واں نہ پائی بار
گلزارِ کن فکاں میں اسی غم سے ہے سدا
اس سوزِ غم سے گرہیں مہ و مہر داغ داغ
یہ شوق جبہہ سائی ہے رکھنا کہ آکے یاں
اُس آستاں کی خاک بھی آجائے ہاتھ اگر
اُس در کا ہووے کیونکہ نہ یہ رتبۂ رفیع
جس سنگ آستاں کا ہے وہ صاحب آستاں
وقتِ سحر ادب سے اُٹھا پنجۂ شعاع
اُس در پہ جبہہ سا ہوا یاں تک کہ ماہ و مہر
اللہ رے تیرا پایۂ رفعت کہ دُور سے
وہ راج راجگان و مہاراج ذی شکوہ
حکم آپ کا وہ ناطق و صادق کہ جس سے آج
کیا فیض آپ کا ہے کہ حاضر ہے جوں گدا
وہ تیغ تیز آپ کی ہے جس کے خوف سے
شمشیر بے نیام سے پھینکو جو ایک ہاتھ
گھوڑے سے آپ کے اسے تشبیہ دے تو دوں
کاوے ہیں اُس کے آن کے جسدم بندھے حصار
اور گرم ہو کے وہ عرق افشاں ہو جس گھڑی

صدقہ زمیں کے ہوتا ہے پھر پھر کر آسماں
اک جا قرار لیتا نہیں دم بھر آسماں
ہر وقت مستعد ہے تگ و دو پر آسماں
بہر جہان جاہ جو ہے برتر آسماں
اُس سنگ در پہ بوسہ دے اک جھک کر آسماں
پھرتا اسی لئے ہے سدا مضطر آسماں
دلتنگ مثل غنچۂ نیلوفر آسماں
رکھتا الم سے ہے دل غم پرور آسماں
سرتا قدم ہوا ہمہ تن ہے سر آسماں
کر لیوے اُس کو زیب سر و افسر آسماں
کیونکر نہ سرفرو ہو وہاں جھک کر آسماں
ہے جسکے نوکروں میں کمیں چاکر آسماں
تسلیم ادا کرے ہے جھکا کر سر آسماں
رکھتا گواہ سجدہ ہے زیب سر آسماں
رہ جاتا جس کو دیکھ کے ہے ششدر آسماں
قدموں میں جسکے خاک ہو ہر پھر کر آسماں
کیا تاب ہووے یک سر مو باہر آسماں
کشتی لئے ہوئے در دولت پہ آسماں
سینہ چرائے بیٹھا ہے خم ہو کر آسماں
جوزا دو پیکر اُس سے ہو صد پیکر آسماں
بازو میں گر لگا لے ذرا شہپر آسماں
کمتر ہو ایک نقطہ سے نہ چنبر آسماں
دامن سے پھینک دے وہیں سب اختر آسماں

تشبیہ دوں جو خیمہ عالی سے آپ کے — جوں غنچہ اپنے جامے سے ہو باہر آسماں
بحرِ فنا میں سمجھے ہے اُس کی طناب کو — بہر جہاز چرخ بریں لنگر آسماں
حاضر ہے ہر گھڑی درِ دولت پہ بن کے فیل — قوس قزح سے ماتھے کو زنجیر کر آسماں
پاس ادب تو دیکھو کہ ہر دم پئے سلام — خرطوم کہکشاں ہے رکھے سر پر آسماں
آتی ہے بزم عیش و طرب میں حضور کے — لولی چرخ لولی و خنیاگر آسماں
دن بھر بجاتا دائرۂ مہر ہے جو چرخ — آتا ہے شب کو ماہ کا دف لیکر آسماں
گلگیر لے کے پھینکے سر شمع سے جو گل — رکھ لیوے سر پہ صورتِ تاج زر آسماں
اور دے کے شادیانۂ فتح و ظفر کہے — اے آفتاب مطلع صد خاور آسماں
یک ملک تو مبارک صد ملک تو دگر — دائم زمانہ یاور و فرمانبر آسماں
چشم کرم ادھر بھی ذرا ہو کہ بے طرح — در پے ہوا ہے میرے یہ بد اختر آسماں
جاؤں کہاں نکل کے زمانہ کے ہاتھ سے — نیچے زمیں ہے سخت تو دور اوپر آسماں
ہر شب کو شام گاہ سے لے تا بہ صبحگاہ — پھرتا زباں نکالے ہے جوں اژدر آسماں
آزاد کرتا ختم دعا پر ہے یہ کلام — جب تک زمین نیچے ہو اور اوپر آسماں
جب تک زمیں زمانے میں ہو مرکز سپہر — گردش میں تا کہ گرد زمیں ہو ہر آسماں
قطبین جب تک اپنی جگہ ہوویں مستقل — گردش میں تا رہے مع ہفت اختر آسماں

رکھے خدا صحیح و سلامت حضور کو
رہوے زمانہ یار تو ہو یاور آسماں

قصیدہ

نیّرِ برجِ شرف حضرتِ صاحب عالم — کس میں یہ تاب کہ حضرت کا ثناخواں ہووے
یعنی عالم میں ہے روشن کہ نہ تا حشر کبھی — ذرّہ کرم صفت نیّرِ تاباں ہووے
حکمت آموز جہاں ذہن رسا آپ کا ہو — واں فلاطوں ہو تو اک طفل دبستاں ہووے
چارہ گر ہووے بہ تدبیرِ جہاں عقل تری — واں ہے بیکار اگر حکمتِ لقماں ہووے

ہووے نیسان کرم تیرا اگر قطرہ فشاں
خالی گوہر سے نہ پھر پنجۂ مرجاں ہووے

گر ہو سیراب ترے ابر کرم سے تو سدا
باغ میں غنچہ کی جا گوہر غلطاں ہووے

تو اگر قدر شناسی کرے بے قدروں کی
بیضۂ مور دُرِ تاج سلیماں ہووے

اور عدو آکے جو سائل ہو تو اُسکے حق میں
آب گوہر سے بپا نوح کا طوفاں ہووے

کیوں کہ پھر دستِ مبارک کو کہوں ابر کرم
ابر ہو قطرہ فشاں وہ گہر افشاں ہووے

عدل سے آپکے گر ہووے نظام شب و روز
خانہ مہر سدا خانۂ میزاں ہووے

ہو ذرا دستِ حمایت سے قوی پنجہ اگر
تو کبھی پنجۂ خورشید نہ لرزاں ہووے

آپ سے معرکۂ جنگ میں اے شاہسوار
کون ہے جو کہ مقابل سر میداں ہووے

آئے بھی سامنے تو ریش دوشاخ اپنی سنبھال
نوک دُم بھاگے اگر رستم دستاں ہووے

ہووے گر سربہ ہوا تیر ہوائی تیرا
نسر طائر کا ہو دل اور ترا پیکاں ہووے

بلکہ حیرت کی نہیں جا کہ عقابِ گردوں
مرغ بسمل کی طرح خاک پہ غلطاں ہووے

ترے گلگون سبک سیر کے ہمراہ رکاب
دم ہے کیا باد صبا بھی کہ شتاباں ہووے

شرق سے غرب تلک جسکے ہے آگے اک بات
کہ ابھی ہووے یہاں اور ابھی واں ہووے

تری شمشیر جو دکھلائے ذرا اپنی چمک
صید رامح ابھی افلاک پہ قرباں ہووے

چرخ پر گاوِ فلک گاو زمیں زیر زمیں
ڈر سے اُس برق جہانتاب کے پنہاں ہووے

تا ہو پانی پہ زمیں اور زمیں کو ہو قرار
اور عالم میں زمیں مرکز دوراں ہووے

قصیدہ

مئے طرب سے ہے از بسکہ جام دل معمور
تو ذرہ ذرہ میں ہے جام آفتاب کا نور

زبسکہ بادہ عشرت سے ہے فلک پہ دماغ
نظر میں پست ہے اور ننگ قیصر و فغفور

ہوا یہ مایۂ عشرت سے دل ہے مالامال
مئے خوشی سے ہے بہ دولت طرب کا وفور

کہ فیض مبدءِ فیاض سے جدھر دیکھو
تمام ارض و سما ہے نظر میں عالم نور

یہ دیکھا جوش مسرت تو میں نے دل سے کہا
کہا یہ اُس نے کہ کیونکر نہ ہوں میں خرّم و شاد
نظر میں پھر گیا اس دم مرے وہ نور جمال
نہ ہے جمال کہ عالم ہے جس کا نور کمال
جو نور حُسن سے اُسکے جہان ہو روشن
سواد خط میں ہے یوں تاب حسن نور افشاں
وہ کون یعنی مہاراج صاحبِ ہمّت
وہ اُن کا فیض کرم ہے کہ جسکے آگے کبھی
تمام بحر و بر و کوہ و دشت عالم میں
چمن بھی ابر کرم سے نہیں رہا محروم
وہ اُن کا اسپ سبک رو کہ فرط سرعت سے
جہاں میں راکب عالی دماغ کو اُس کے
ازل سے طے کرے اک دم میں تا بروز قیام
وہ اُس کی تیغ شرر دم ہے رشک تیغ قضا
دہان زخم میں کہتے یہ اُسکے ہنس ہنس کر
وہ اُن کا تیر بلا ہے نشان تیر قضا
زبان تیر کہے ہے سدا بگوش کماں
کہ میں ہوں تیر قدر اور تو کمان قضا
گراؤں مثل کبوتر سماک رامح کو
بیاں ہو وصف تفنگ اُن کا کس طرح سے بھلا
فلک پہ لوٹتا پھرتا ہے نسر طائر بھی
وہ اُن کا فیل فلک رفعت و جبل پیکر
سوار جبکہ ہوئے اُس پہ وہ بصد تمکیں

سبب ہے کیا کہ جو ہے آج اتنا تو مسرور
شراب عیش سے ہو کیوں نہ جام دل معمور
ظہور نور سے جس کے زمانہ ہے معمور
دکھائی آنکھوں سے ہے قدرت خدا کا ظہور
تو ہووے رشک شبِ چاردہ شبِ دیجور
کہ جس طرح سے شبِ تار میں اُڑے کافور
کہ بندہ جس کا دبِ تسلیم اور غلام ہے فور
نہ ہو سخاوتِ حاتم کا بھول کر مذکور
زبسکہ فیض کرم اُن کا ہے علی الجمہور
زر بہار سے ہے یعنی جام گل معمور
رہی ہے مثل نظر چشم خلق سے مستور
جو سیر ہو سر میدان کن فکاں منظور
جہاں کے مدتِ طولانیِ سنین و شہور
جُدا نیام سے رہووے بسان ظلمت و نور
بتوں کی تیغ ادا زنگ خوردہ ہے ساطور
خدنگ ناز بتاں کی طرح کرے نہ قصور
عبث جہان میں ارجن کا بان ہے مشہور
ہدف ہے جس کی سدا جان دشمن مقہور
نہ ہووے گر سپرِ آسمان میں مستور
کہ جس کا پلّہ ہے سو پلّہ حد وہم سے دور
کہ بسملوں میں کسی طرح اُن کے ہو مشہور
کہ فیل چرخ بھی ہو جس کا ایک خر مقہور
دلِ جہاں سے یہ نکلی صدا بفرط سرور

وہ نکلا مشرق خوبی سے آفتاب جمال
سمٹ کے آگئی زیر قدم شب دیجور

دُعا جناب الٰہی میں اب یہ ہے **آزاد**
کہیں بصدق دل آمین سب اناث و ذکور

رہیں وہ خرم و خوشحال اور عدو اُنکے
ہمیشہ کشتہ ہوں یا خستہ ہوویں یا رنجور

بکامیابی احباب اپنے اعدا پر
رہیں مدام جہاں میں مظفر و منصور

سدا بجاہ و حشم دست جود سے اپنے
جہاں کے دامنِ اُمید کو کریں بھرپور

قصیدہ

فروغ نور سے کس کی ہے یہ جہاں روشن
کہ ہے زمیں سے دلا تا بہ آسماں روشن

زبسکہ عام ہیں انوار مہر ذرہ نواز
یہاں جہاں ہیں منور مکاں مکاں روشن

یہی نظر ہے کرم کی تو چرخ پر ہونگے
بشکل ماہ ثریا و فرقداں روشن

طلوع نیرِ اعظم کا دیکھنا جلوہ
ہوئی ستارہ نمط چشم مردماں روشن

چراغ گل کے یہ انوار ہیں چمن میں کہ ہے
برنگ کشت فلک باغ کن فکاں روشن

زبسکہ ہے یہی شایان شان مہر کرم
کرے فروغ سے روے ستارگاں روشن

پئے شعاع ہے لازم سرایت انوار
کہ ہوں زمیں میں جگر ہاے بحر وکاں روشن

ملا اسی لئے نیساں کو بلکہ آب کرم
کہ قعر بحر میں ہوں شاہ گوہراں روشن

اسی طرح پئے خورشید سلطنت ہے ضرور
کہ جوں ستارہ کرے بخت دوستاں روشن

یہ وہ ستارہ ہیں روشن گہر کہ کر دینگے
زمیں کی سطح کو جوں اوج آسماں روشن

سدا برنگ گلِ آفتاب گلشن میں
نظر بھر رکھیں صحن بوستاں روشن

سپہر مرتبہ رندھیر سنگھ ذرہ نواز
فلک عزیمت و مہ طلعت و رواں روشن

گل نہال کرم نونہال گلشن فیض
ہے آب و رنگ سے جسکے رخِ جہاں روشن

ملا حضور کو جو ہے خطاب نیرِ ہند
ہوئے ہیں بخت زمان و زمانیاں روشن

یہ فیض ہاے تجلی زمین زماں پہ ہیں عام
کہ چشم پیر ہے اور طالع جواں روشن

ہوئے یہ نور سے روشن ہیں دیدۂ دل ہند / کہ جوں سہیل سے چشم یمانیاں روشن
نہ کیونکہ ناصیہ چرخ پر ہو یہ مرقوم / کہ سال حال سے تاریخ ہے عیاں روشن
ازل کے دن سے ہے رندھیر سنگھ اختر ہند / رکھیگا تا بہ ابد چشم کل جہاں روشن
دعا ہے بندہ آزاد کی یہ شام و سحر / کہ شام تا ہو سیہ اور سحر عیاں روشن
برائے شمس و قمر تا کہ ہو فلک فانوس / فلک کے شیشہ میں تا ہوئے شمعداں روشن
یہ تارہ ماہ ہو اور ماہ ہو کے بدر کمال / رہے یہ پر تو خورشید خاوراں روشن
سدا ستارہ اقبال آپ کا رہوے / باوج مطلع اقبال جاوداں روشن

رہے تجلی مضمون مدح سے دائم
بسان شمع فروزاں مری زباں روشن

قصیدہ

صبا گزارتی ہے گل کو پرچۂ اخبار / کہ آئی فوج خزاں بر سر قشون بہار
نشاط و عیش کے مجمع میں پڑ گئی ہل چل / کیا جو پیک صبا نے یہ گل کے گوش گزار
بسان ترک فلک آیا لے کے لشکر جنگ / کہ گل سپاہ ہزارہ کا ہے سپہ سالار
خبر یہ سن کے چمن میں ہوئی کمر بندی / سجے بدن پہ جوانوں نے جنگ کے ہتیار
کھڑا تھا سرو سہی آ گے سنتری کی طرح / پہن کے وردئ سبز اپنے پہرہ پہ ہشیار
لئے تفنگ و جزائل تھی شاخ کاندھے پر / برنگ گلہ اتواپ تھے ترنج و انار
صف مصاف میں سورج مکھی سپر بر رخ / لئے ہے ہاتھ میں شاخ اپنا نیزہ خونخوار
بنفشہ ہاتھ میں لیکر کمند مشکیں کو / ہوئی نبرد کو دشمن کے سر بسر تیار
لگا کے ابر نے تب مورچہ پہ رعد کی توپ / تگرگ بارئ باراں سے خوب کی بھرمار
اڑاتی برق کی رنجک تھی ہر طرف چشمک / کہ گر ہے مرد تو میداں میں آ بگرد بہار
تمیز غالب و مغلوب سے لڑائی میں / ہوئی شکست قشون خزاں کو آخر کار
زبس نبرد میں مارے گئے چمن کے جواں / تو ان کے واسطے گریاں ہوا تھا ابر بہار

ہوئی جو تیرگی و خیرگی جہاں سے دُور
لگایا خسرو خاور نے خیمۂ زنگار

عروس شام نے گلگونۂ شفق مُنہ پر
لگا کے خوب سی کی زیب و زینت رخسار

چہ لیل لیلے عصمت سرائے بہروزی
چہ شب تصدق او صد ہزار لیل و نہار

نہادہ افسر شاہنشہی بہ تارک گل
صنوبر و سمن و ارغواں یمین و یسار

سواد شام میں ناگہ ہوئی نمائش نور
تو خضر راہ نے مجھ سے کہا یہ ہو کے دوچار

پڑا ہے کس غم و اندوہ میں تو اے غافل
نکل کے کلبۂ احزاں سے دیکھ تو اک بار

نشاط جشن سے عالم میں کیا بہار ہے آج
زمیں سے تا بفلک ہے ترشح امطار۔

قصیدہ کر وہ رقم مدح خسروانی میں
کہ جس کی نظم پہ اعجاز خسروی ہو نثار

کہا یہ میں نے بھی سُنتے ہی مطلع دلکش
کہ حسن مطلع روشن ہو مطلع انوار

فروغ رخ ترا اے آفتاب پر انوار
کرے ہے معنی والشمس والقمر اظہار

نہال عمر ترا گلشن زمانہ میں
رکھے سدا گل اورنگ طرۂ دستار

ہوا ہے عدل ترا بسکہ جامع الضدین
تو رشتہ دار ہیں آپس میں سبحہ و زنار

اگر نیام سے باہر ہو تیری برق غضب
کمر سے کھول کے مریخ پھینک دے تلوار

دو نیم تیغ سیاست سے تیری جوزا ہے
یتیم بطن صدف میں ہے لولوے شہوار

جو تیرے خوف سے قالب تہی کریں ظالم
نیام خنجر بیدم ہو خنجر خونخوار

زمیں سدا رہے پھرکی کی طرح گردش میں
جبال حلم سے تیرے اگر نہ ہو پُر بار

تری تفنگ دو مبلہ کی کیا کروں تعریف
کہ نسر طائر و واقع ہیں دونوں اس کا شکار

تری خدنگ کے قرباں کہ غرق ہے یکسر
دل حسود میں پیکاں سے لے کے تا سوفار

سخا و فضل و کرم علم و فضل یوں تجھ سے
حواس خمسہ پہ جس طرح زندگی کا مدار

کیا ہے اہل ہوس کو بھی تو نے اتنا سیر
عسل سے مور کو نفرت مگس کو قند سے عار

سباق ہیں تجھے سبقت ہے سابقینوں پر
سباق تجھ سے سبق خواں ہے آگے کودک وار

فلک ہے غرق عرق ہووے شرم سے نیساں
زمیں پہ گر ترا ابر کرم ہو گوہر بار۔

عطائے عام کرے تو جو خلق پہ بہم
تو فکر فلسفی و ہندسی سے ہو نہ شمار

ہے تیری ذات سراپا صفات چشمۂ فیض
بجا ہے اُس پہ جو گرویدہ ہوں صغار و کبار

زبسکہ نیت عالی تری سدا ہے بخیر
وہ تیری رائے ہے اعجاز عیسوی آثار

کہ مثل مردۂ صد سالہ تھے جو علم قدیم
کیا ہے زندہ اُنہیں تو نے اے سپہر وقار

دُعا یہ کرتا ہے آزاد ختم اب یہ کلام
گراں نہ خاطر عاطر پہ ہوں فزوں اشعار

الٰہی آب پہ ہو تا زمیں زمن کو ہو دور
زمیں کے گرد ہو تا شمس اور قمر کا گزار

تری صلاح سے عالم رہے صلاح پذیر
ہمیشہ ہو تری اصلاح پر جہاں کا مدار

رہے جہان پہ سایہ ترا سدا قائم
ترے قیام سے قائم ہوں فیض کے آثار

قصیدہ

ہجوم فکر سے ہو کر بہ تنگ میں ناکام
فضائے وادیٔ دل میں سحر تھا گرم خرام

برنگ جوش بہار آیا سامنے میرے
سرور و عیش و نشاط و طرب کا مجمع عام

کہا یہ میں نے کہ اے آب و رنگ گلشن دہر
تمہارے فیض قدم سے چمن شگفتہ تمام

یہ جمع ہو کے جو آتے ہو سب کے سب باہم
کدھر سے کوچ ہوا اور کدھر ہے آج مقام

برنگ نو گل خنداں بصد نشاط و سرور
دیا جواب کہ اے شاعر خجستہ کلام

تجھے خبر نہیں اب تک مقام حیرت ہے
گزارتا ہے کہاں زندگی کے تو ایام

اُٹھا کے آنکھ ذرا رنگ تو جہان کا دیکھ
زمانہ رشک طلسمات ہو رہا ہے تمام

فلک کو دیکھ کہ ہے شرق و غرب اطلس پوش
زمیں کو دیکھ کہ ہے سربسر زمرد فام

میان بزم چمن دیکھ غنچہ و گل کو
بغل میں اس کے صراحی ہے اُسکے ہاتھ میں جام

قفس میں بلبل شیدا کے پاس گلشن سے
ہے لاتی باد صبا دم بدم طلب کا پیام

پہن کے جامۂ گلرنگ و خلعت زرتار
بسان دستۂ گل جمع ہیں خواص و عوام

تجھے بھی چاہئے کچھ نذر چل کے گزرانے
جو زر نہ ہووے گرہ میں تو گل سے لے لے دام

سخن نے اُسکے کیا ایسا منفعل مجھکو — کہ غرق بحر خجالت میں ہو گیا ہوں تمام
فلک کے دست تطاول سے کیسۂ دل میں — سوائے داغ نہ باقی درم رہا ہے نہ دام
پڑا بھڑکتا ہے صندوق سینہ مثل تنور — خزانہ ہو گیا گویا خزانۂ حمام
مگر جواہر معنیٰ و لفظ رنگیں کو — بہ لعل لخت جگر دے کے انضمام تمام
پرویا سلسلۂ نظم شعر میں میں نے — کہ پائے نظم ثریا کی طرح حسن نظام
سو نذر لے کے یہ حاضر ہوا ہوں خدمت میں — باستان فلک رتبہ و سپہر مقام
فلک پناہ و کواکب سپاہ و کیواں جاہ — قمر رکاب فلک رایت و ظفر اعلام
جہان دانش و کوہ ثبات و کان کرم — سحاب ہمت و بحر سخا و ابر غمام
وہ کون یعنی کہ رنبھیر سنگھ عالی جاہ — فروغ حشمت جمشید و افسر بہرام
بلند فکر کہ رفعت سے جسکی ہو کوتاہ — بسان دست شکستہ رسائی اوہام
دقیقہ یاب کہ دقت سے جسکے ہوں معذور — مثال دیدۂ اعمیٰ دل اولی الافہام
کرے جو فیض کرم اُس کا خلق کو شاداب — شمیم خلق معطر کرے جہاں کا مشام
نہیں ہے فیض سے ہاتھ اُس کا ایکدم خالی — کبھی زمانہ پہ انعام ہے کبھی اکرام
شکوہ جلوہ ہے یوں اُسکے بر سر اورنگ — کہ تخت شرق پہ جوں شاہ خاوراں کا قیام
فروغ حُسن جو دکھلائے اُسکا نور جمال — تو مہر ڈال لے مُنہ پر نقاب طرۂ شام
براس و چپ پہ آئین بزم پُر تزئیں — سکندر آئینہ جمشید ہے لئے ہوئے جام
قلم سے وصف شجاعت رقم ہو گیا اُس کا — کہ فرط رعب سے شق ہو گیا جگر ہے تمام
وہ اُس کی تیغ شرر دم ہے رشک تیغ قضا — ہمیشہ سینۂ اعدا کو سمجھے اپنا نیام
بروز معرکہ ہے بحر و بر میں وہ شمشیر — نہنگ بحر وغا و پلنگ خوں آشام
جو کرکے نعرۂ شیرانہ دشت ہیجا میں — ڈپٹ کے گھوڑے کو لیوے کمر سے وہ صمصام
یہ رعب چھائے دلوں پر کہ مارے دہشت کے — لرز کے ہاتھوں سے رستم جگر کو لیوے تھام
وہ اُس کا اسپ صبا سیر رشک شعلۂ برق — خیال سرعت و گردوں شکوہ کبک خرام
حواس ہوش سکے اُڑتے ہیں کیا کہے اُسکو — کہ مرغ وہم سے جاتا ہے آگے سو سو گام

ترارہ بھرتا ہے اور ہے تڑپ کے رہ جاتا — کہ تن پہ ارض و سما کر رہے ہیں تنگی دام
ملی ہے خوبیٔ قسمت سے آج بار مجھے — بہ بزم خاصۂ شاہنشہِ سپہر مقام
سناؤں مطلعِ حاضر وہ اب حضوری میں — کہ جس کو دیکھ ہو بے نور روئے ماہ تمام
شہا تو وہ ہے شہنشاہ واجب الاعظام — کہ خسروانِ جہاں تیرے بے درم ہیں غلام
بسانِ تیغ رواں ہے حضور کا ہر حکم — قضا کو ہے کبھی تعلیق اور کبھی ابرام
جہاں پہ عام ہے اس طرح فیض عام حضور — کہ نور مہر ہو جس طرح ذرہ ذرہ پہ عام
ٹپک کے جام سے قطرہ نہ پھر زمیں پہ گرے — جو پا فتادوں کو لے دستگیری آپ کی تھام
وہ بند و بست ممالک میں ضبط نظم و نسق — مدار گردشِ نہ آسماں کا جسپہ نظام
جہاں ترازوئے نصفت لئے ہے آپکا عدل — وہاں کا مہر ہے میزاں میں سال و ماہ مدام
زہے عدالت و انصاف جسکے سامنے ہے — زمیں کے صفحہ سے نوشیرواں کا مٹ گیا نام
ہوائے ظلم دلوں سے یہ ظالموں کے ہے محو — کہ باز پالتے ہیں بچہ ہائے کبک و حمام
زبسکہ اہل ستم دست و پا شکستہ ہیں سب — ستم زدوں کا ستمگاروں پر ہے غلبہ تمام
پلنگ و شیر کو جنگل میں گھیرے پھرتے ہیں — قطار آہوئے دشتی و گلۂ اغنام
وہ لشکر آپ کا نصرت نشان و فتح نصیب — کہ ایک ایک جواں جس میں رشک رستم و سام
صدائے توپ و تفنگ انکے معرکہ میں سدا — برائے روح مخالف ہے موت کا پیغام
عدو کے دل جو ہوں بادل تو یوں اڑا دیویں — کہ جیسے بان سے ارجن کے پردہ ہائے غمام
کریں پریٹ پہ جب مشق چاند ماری کی — نشانہ چادر گردوں پہ سمجھیں ماہ تمام
وہ انکی توپ دھواں دھار کوہسار شکن — کہ روز جنگ عدو پر ہو تیرہ بختی شام
گراں کے سامنے لنکا کا کوٹ آجاوے — تو مثل حرف غلط دیں مٹا جہاں سے نام
دعا پہ ختم کر آزاد اب یہ بحر طویل — گراں نہ خاطر نازک پہ گزرے طول کلام
الٰہی تا کہ ہو نوروز طرۂ دستار — سر سنین و شہور و لیالی و ایام
فلک کے چتر کو جب تک سر زمیں رہے دور — سریر ارض کو جب تک نہ فلک ہو قیام
مدام تاج شہی ہووے زیب فرق حضور — سریر دولت و اقبال ہو تہِ اقدام

نشاط و عیش کا ہنگامہ شام سے تا صبح | سدا ہو انجمن جشن صبح سے تا شام

بزور تیغ مخالف شکار ہوں تسخیر
دیار ہند سے تا چین و روم سے تا شام

قصیدہ (ناتمام)

بعز عرض خداوند صاحب عالم — کہ بندہ جس کا ہے جم خانہ زاد افریدوں
فراسیاب و کیومرث و نوذر و ہوشنگ — قباد و طور سے لے تا بہ خسرو پرغوں
ہر اک ہے بندۂ دیرین و خانہ زاد قدیم — مجال کیا جو کریں آگے تیرے ہوں سے توں
ملک سپاہ و فلک بارگاہ و کیواں جاہ — کہ ہفت پشت سے جس کا غلام ہے گردوں
گل مراد شگفتہ ہوتا رہے شاداب — فیوض رحمت باری سے باغ کن فیکوں
ہے عرض بندۂ آزاد با ہزار نیاز — بعرض جوہر تسلیم فدویت مشحوں
کہ گرچہ شوق جبیں سائی در دولت — شروع سن صبا سے میں دل میں رکھتا ہوں
ولے نہ آئے کبھی راہ راست پر ہرگز — یہ میرے طالع برگشتہ اور بخت نگوں
ہمیشہ قید علائق تھے مجھ کو قید فرنگ — ہمیشہ سلسلۂ پا تھا طالع واژوں
بقید مدرسہ ۹ سال اس طرح گزرے — کہ جیسے بند قفس میں ہو بلبل محزوں
مگر ہمیشہ سے تھی طبع خود بخود مائل — باکتساب علوم و باجتنائے فنوں
بصرف و نحو و معانی گہے بعلم ادب — گہے بعلم لغت ہوتا شوق دل تھا فزوں
کبھی صحاح تھی پیش نظر کبھی قاموس — محاورات عرب پر زبس تھا دل مفتوں
گہے بعلم حدیث و گہے بعلم اصول — گہے بفقہ و فرائض تھی طبع راہنموں
پڑھے ہمیشہ فتاوائے ملت حنفی — کہ ہووے آگہی فرض و واجب و مسنوں
گہے بسوئے قرائت گہے برسم الخط — گہے بعلم تفاسیر دل سے تھا مفتوں
گہے بہ فلسفہ گاہے بہ منطق و حکمت — گہے بسیر کواکب تھی طبع راہنموں
گہے شفا و اشارات تھی بزیر نظر — کبھی تھا پیش نظر کلیات ابن کموں

کبھی یہ بحث ہیولے و جسم تعلیمی
ہوا فلاسفہ کی طرح خلق میں مطعون

کبھی تھی بحث مجسطی و شرح چغمینی
زباں پہ زیچ الغ بیگ کا رہا مضموں

کبھی لگا کے سطرلاب سیکھتا تھا میں
حساب سیر کواکب بگردشِ گردوں

کبھی میں کرتا بتقویم سال استخراج
کہ کس ستارہ کو رجعت ہے اور کس کو سکوں

گہے بعلم نجوم و گہے بعلم رمل
میں دیکھ زائچہ کرتا تھا خوش دلِ محزوں

بطور اہل جفر کھینچتا کبھی تکسیر
کہ تا کچھ اپنے دلِ زار کو تسلی دوں

بدرس شاستر و چار بید و ہشت پُران
ارادہ یہ کہ گرو سارے ہندیوں کا بنوں

بہ یمن خدمت و فیضانِ معبدانِ کہن
یہ علم کیش زراتشتیاں تھا روز افزوں

کہ فیض درس دساتیر و زند و استا سے
تھا آئینہ خطِ ترسا سے تا خط واژوں

جو کچھ کہ ہندسہ و طبعی و ریاضی پر
ہے کی مشقت و محنت وہ کیا زباں سے کہوں

کبھی تھا پڑھتا میں تاریخ و علم جغرافی
کہ گھر میں بیٹھا ہوا سیر اک جہاں کی کروں

کبھی تھا جوگیوں کی طرح شوق استدراج
گہے قیافہ و گاہے سرودہ گاہ شگوں

علاوہ مدرسہ کے جا کے سالہا سیکھے
قواعدِ گورنمنٹ و انگلشی قانوں

زبسکہ عالمِ طفلی سے تا زمانۂ حال
ہمیشہ خدمتِ استاد میں تھا یہ محزوں

وہ کون یعنی کہ استاد کل بکل امور
خدائے ملک سخن ماہر علوم و فنون

وہ **ذوق** جس کا ہے ثانی جہاں میں ناممکن
بزیر گنبد گردان و چرخ نیلی گوں

کہ جسکے قلزمِ ذخار علم کے آگے
ہے قطرہ حکمت لقمان و علم افلاطوں

قلم وہ بحر معانی کہ اک شگاف اس کا
رکھے ہے زیر بغل دونوں جیحون و سیحوں

چراغ مہر اگر لے کے ڈھونڈے پیرِ فلک
نہ ایسا صاحب جوہر ملے تہِ گردوں

نہ مہر علم کو کرتا بزیر خاک نہاں
تو کون کہتا زمانہ میں یہ کہ چرخ ہے دوں

فلک کی سرخئ شام و سحر سے ثابت ہے
شفق نہیں یہ کسی کشتۂ جفا کا ہے خوں

جو خوب دیکھا تو آخر یہی ہوا معلوم
مئے طرب سے ہے خالی یہ کاسۂ واژوں

جو اس الم سے ہو خاکستری لباس زمیں
تو کیونکہ چرخ نہ پہنے لباس نیلی گوں

سخن شناس جگر خوں ہیں بسکہ اس غم سے
فلک پہ مہر نکلتا ہے سر برہنہ سحر
ہے گرچہ نقدِ معانی سے طبع مالا مال
سمجھ کے اس درِ دولت کو مرجعِ عالم
زمین پاؤں کے نیچے سے نکلی جاتی ہے
مدام سنگِ الم سے ہے چور شیشۂ دل
شفق کی سرخیٔ شام و سحر سے ہے ثابت
یہ وہ الم ہے کہ کاہش سے جسکی مہرِ فلک
جو نقدِ علم بہ اقبال بندگان حضور
کہ فیضِ دیدۂ خونبار سے مراد امن

بجا ہے جاری اگر دیدۂ فلک سے ہو خوں
شفق سے شام کو ہے دامنِ فلک گلگوں
مگر جو دل میں ہے مضموں کہوں تو کس سے کہوں
نظر بہ عرضِ مطالب ہوا ہیں حاضر ہوں
زبسکہ بر سرِ پرخاش مجھ سے ہے گردوں
ہمیشہ آتشِ غم سے جگر برشتہ ہوں
کہ شب کو اہلِ زمیں پر ہے مارنا شبخوں
ہلال وار ہے کاہیدہ برسرِ گردوں
رکھوں ہوں دل میں نہاں مثلِ گوہرِ مکنوں
×ہے رشکِ تختۂ گل لالہ ہائے بوقلموں

× [illegible]

زبسکہ خنجرِ غم سے فگار ہے سینہ
تو تیر آہ نکلتا ہے دل سے غرقِ بخوں

سہرا

آج اُس عزتِ گلزار کے سر سہرا ہے
رخِ تاباں پہ جو لہراتے ہیں مقیش کے تار
ہے یہ وہ روز کہ اقبال و سعادت کا آج
لایا سہرے کو ترے گوہرِ انجم اپنے
کنگنہ ہاتھ میں اور طرہ کے سر صدقہ بہار
تار بارش میں ہے لایا دُرِ خوش آب پرو
شاخِ گل سے یہ پڑے پھول ہیں جھڑتے کہ صبا
نور ٹپکے ہے پڑا روئے مصفا سے ترے

تو مبارک ہو دلا یار کے سر سہرا ہے
دن دئے مہرِ پُر انوار کے سر سہرا ہے
تجھ سے نوشاہ خوش اطوار کے سر سہرا ہے
کہ یہ اس گنبدِ دوّار کے سر سہرا ہے
سر پہ دستار ہے دستار کے سر سہرا ہے
اب تو نیسان گہربار کے سر سہرا ہے
چمن دہر میں ہر خار کے سر سہرا ہے
اب تو آئینہ رخسار کے سر سہرا ہے

واہ رے جوش طرب جھڑتے ہیں منقار سے پھول
باغ میں مرغ چمن زار کے سر سہرا ہے

پھولوں جامہ میں نہیں اپنے سماتی ہے نسیم
اب تو اس نکہت گلزار کے سر سہرا ہے

تاب رخ سے ہے ترے نکلی یہ سورج کی کرن
کہ ترے روے پر انوار کے سر سہرا ہے

گل مضموں کا ہے اک تار بندھا جوں گلریز
واہ کیا کلک گہر بار کے سر سہرا ہے

گنج خسرو نہ کبھی بیگ ہیں لے باندھتا جو
آ کے نوشاہ خوش اطوار کے سر سہرا ہے

کہتے آزاد سے ہیں نغمہ سرایان سخن
اب تو اس بزم میں سرکار کے سر سہرا ہے

دیگر

لاؤ بنے دا سہرا جان مالنیا لاؤ بنے دا سہرا
جم جم آؤ نت آؤ دھن مورے بھاگ

پیروں گھس گھس چندن لگاؤں بیٹھو مورے اگنیا
لاؤ بنے دا سہرا جان مالنیا لاؤ بنے دا سہرا

اے صبا بلبل شیدا کی ہے گل سے شادی
دیتے مرغان چمن مل کے مبارک بادی

لاؤ بنے دا سہرا پھل موتیا دے موتی
گوندھے لعل بدخشاں پھول گلاب

کلیاں دلاں دی سب کھل رہیاں
نوشاہ بنے دا بیاہ رچا ہے کہیں ہمہ رنگ سیاں

لاؤ بنے دا سہرا جان مالنیا لاؤ بنے دا سہرا

گاتی پھرتی باغ میں بلبل مبارکباد ہے
سرو قمری کا ہو گلشن میں جو گھر آباد ہے

خطاب بہ قلم

اے قلم آ کہ سر صفحہ لکھوں نام خدا
جو کہ لے نام خدا اس پہ ہے انعام خدا

نوجوانی میں مری تیغ شرر بار رہا
کرتا اعدائے بد اندیش کو فی النار رہا

پر اب ایام ضعیفی نظر آتے ہیں قریب
فضل اپنے سے جو اللہ کرے عمر نصیب

اے مرے دوست نہ تو مجھ سے جدا ہو جانا
اپنے آزاد کی پیری کا عصا ہو جانا

اشعار متفرق

کس نظر سے تھا رکھا ظالم نے پیکاں تیر میں
بوند ہو کر آہ اُترا ہے دلِ دلگیر میں

ولہ

غنچہ چمن میں بزم میں تصویر بول اُٹھے
مُنہ سے اگر وہ عالمِ تصویر بول اُٹھے

ولہ

میں وہ نہیں ہوں کہ ہوں تجھ میں اور تو ہو کہیں
وہ گل کھلوں کہ ہوں گلبن پہ اور بو ہو کہیں

ولہ

ہوا لیلی پہ مجنوں کوہکن شیریں پہ سودائی
محبت دل کا اک سودا ہے جسکی جس سے بن آئی

ولہ

ہمارے دل ہیں تمہیں ہو تمہیں ہماری قسم
مگر یقین ہی کب آئی تمہیں ہماری قسم

ولہ

وہ تو جس بات میں دیکھو ہمیں دم دیتے ہیں
اور ہمیں دیکھو کہ ہم اس پہ بھی دم دیتے ہیں

ولہ

دل ہے دیوانہ تو پڑھنا میرا دیواں چاہیئے
سیرِ مضموں ہے اگر سیرِ پرستاں چاہیئے

ولہ

یہاں تو آج تک اچھی ہی گزری
اگر ہے فکر کل کی آبرو کی
زباں ہے پاک ہردم نام حق لے
نہیں عاشق کو کچھ حاجت وضو کی

ولہ

بے قراری نے کیا کچھ نہ اثر
ہم بھی اب صبر کئے بیٹھے ہیں

شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد کی تصنیفات طبع جدید

قندِ پارسی } فارسی زبان کے سیکھنے کے لئے ایک مفید رسالہ ہے۔ مصنف نے سیاحتِ ایران میں جو مختلف اشخاص سے گفتگوئیں کیں جس قدر کارآمد ہیں تمام اس میں درج ہیں۔ زمانۂ حال کی فارسی کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ سفید ڈمائی کاغذ پر۔ تقطیع ۲۲×۲۹ چھوٹی۔ حجم ۱۶۰ صفحہ۔ قیمت ۸/

نصیحت کا کرن پھول } تعلیم نسواں کی نسبت ایک میاں بیوی کی دلچسپ بحث آسان اردو زبان میں۔ لڑکیوں کے پڑھنے کے لئے مفید اور مناسب ہے۔ تقطیع ۲۲×۲۹ چھوٹی۔ حجم ۱۲۲ صفحہ۔ قیمت ۴/

دیوانِ ذوق } ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمۃ کا کلام استاد موصوف کے قلمی مسودوں سے جمع کیا ہے۔ سوانح عمری اور اکثر غزلیات و قصائد کے متعلق دلچسپ نوٹ مولانا آزاد نے خود لکھے ہیں۔ سراپسوری کاغذ تقطیع ۲۰×۲۶ حجم ۴۰۴ صفحہ۔ قیمت عہ/

آبِ حیات } تذکرہ شعرائے اردو۔ پہلے ۷ دفعہ چھپ چکا ہے۔ اب اعلیٰ درجہ کے سفید ولائتی کاغذ پر بہت خوشخط چھپا ہے۔ کتاب کے اول میں مصنف کا فوٹو ہے۔ تقطیع ۲۰×۲۶ حجم ۵۲۸ صفحہ۔ قیمت عہ/

نیرنگِ خیال } اس میں استعارہ کے مضامین درج ہیں۔ دنیا کی ابتدائی حالت۔ سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ۔ شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار وغیرہ وغیرہ مطالب پر خیالات کو وسعت دی ہے۔ اعلیٰ درجہ کے سفید ولائتی کاغذ پر تقطیع ۲۰×۲۶ حجم ۱۴۴ صفحہ۔ قیمت ۱ر

دربارِ اکبری } جلال الدین اکبر شہنشاہ ہندوستان اور اس کے امرائے جلیل القدر کے دلچسپ حالات۔ اصل میں یہ کتاب اس عہد کی ہندوستان کی تاریخ ہے۔ پہلے ایک دفعہ چھپی تھی۔ اب دوسری دفعہ کسی قدر ترمیم کے بعد چھپی ہے۔ اور جو تغیر و تبدل پہلے اڈیشن میں کیا گیا تھا اس میں نہیں ہے۔ مصنف کا فوٹو اول میں لگایا ہے۔ اعلیٰ درجہ کے سفید کاغذ پر تقطیع ۲۲×۲۹ حجم ۸۵۰ صفحہ۔ قیمت تین روپے (عہ)

کتب مذکورۂ بالا صرف ہماری دکان سے نقد قیمت پر یا بذریعہ ویلیو پے ایبل مل سکتی ہیں ہر ایک کتاب کی ۲۵ جلد یا زیادہ کے خریدار سے معقول رعایت کی جائیگی۔

المشتہر خلیفہ سید محمد سالم مینجر آزاد بک ڈپو۔ اکبری منڈی۔ لاہور

اِطّلاع

یہ کتاب حسب ضابطہ رجسٹری ہو گئی ہے
اِس لئے کوئی صاحب اس کا جزو یا کُل
بِلا اجازت راقم طبع نہ فرمائیں۔ اور
جس کتاب پر راقم کے قلمی دستخط نہ ہوں
وہ مال مسروقہ سمجھی جائیگی۔

بنت محمّد ابراہیم
مُنصف امرتسر